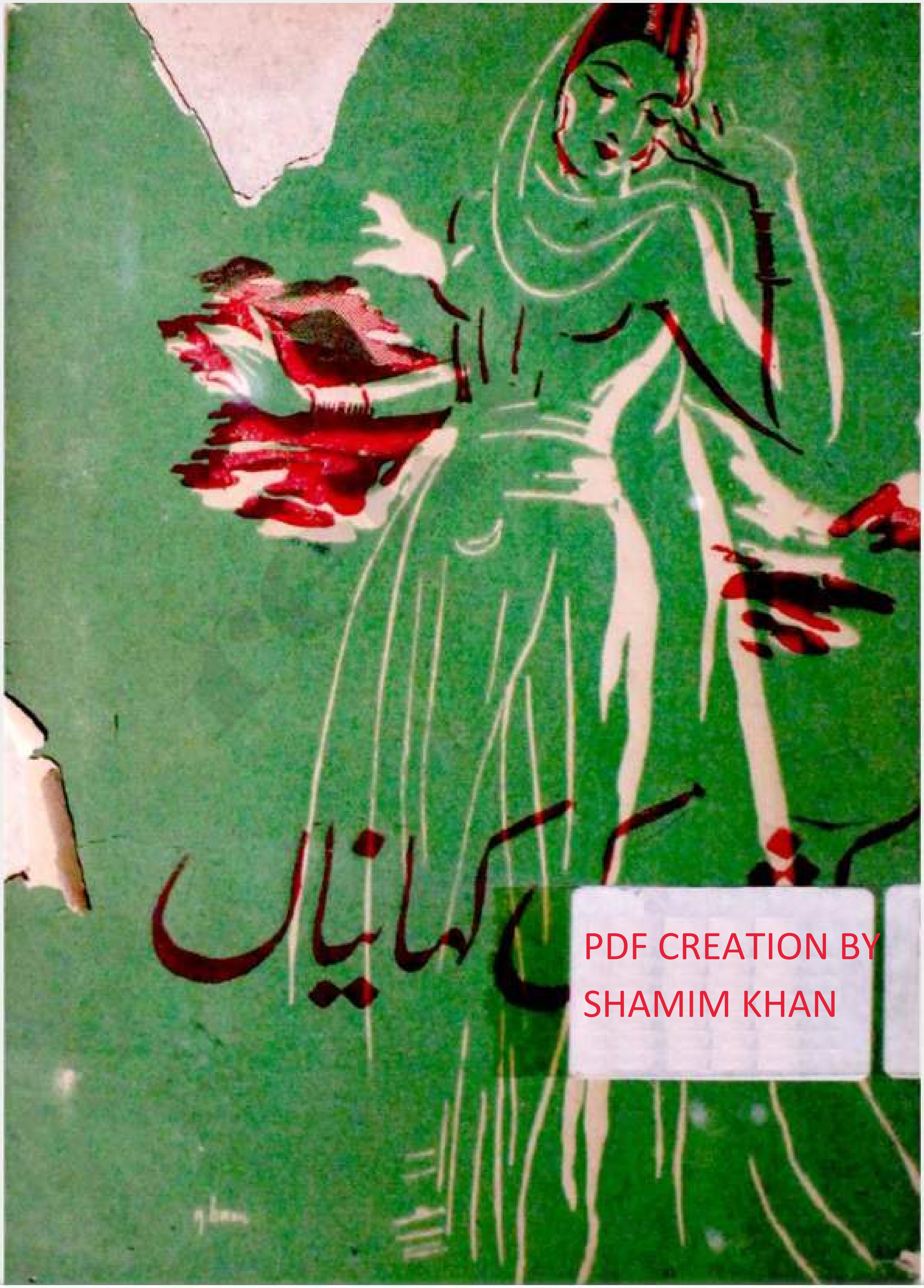

کہانیاں
PDF CREATION BY
SHAMIM KHAN

کشمیر کی کہانیاں

کرشن چندر

الہ آباد پبلشنگ ہاؤس
الہ آباد

تنقیدی جائزے

سید احتشام حسین

(نیا ایڈیشن)

احتشام حسین اردو کا وہ تنہا ممتاز نقاد ہے جو ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ جن کی تنقیدوں نے ترقی پسند ادب کے ہر موڑ پر نشان راہ کا کام کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے اردو کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ احتشام حسین کا نام لیا جاتا ہے۔

"تنقیدی جائزے" احتشام حسین کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں یہ مضامین اپنی شہرت کی بنا پر اردو پڑھنے والوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اعلیٰ نصاب میں "تنقیدی جائزے" شامل ہے۔

ادب کے ہر طالب علم کے لئے "تنقیدی جائزے" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیمت — تین روپئے

الہ آباد پبلشنگ ہاؤس
الہ آباد

قیمت تین ۳ روپے

بار اول اکتوبر ۱۹۴۹ء

سلیمی برقی پریس یحییٰ پور الہ آباد سے چھپ کر الہ آباد پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے شائع ہوئی

ترتیب

پیش لفظ

میں نے کشمیر سے متعلق بہت سی کہانیاں لکھی ہیں، اس کے حسن کے متعلق، اس کی بدصورتی کے متعلق، اس کے جاگیردارانہ ماحول اور اس کی چیرہ دستیوں کے متعلق، کشمیری عوام کی غربی اور اُن کی کش مکش سے متعلق، یہ کہانیاں میں مسلسل لکھتا آیا ہوں اور آج بھی جب کشمیر اک عجیب دردناک صورت حالات سے دوچار ہے، میں کشمیر سے سیکڑوں میل دور رہ کر بھی اس کے متعلق لکھنے پر مجبور ہوگیا ہوں، اگلی پچھلی کہانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ اک ایسے انتخاب کی سخت ضرورت ہے۔ جس میں کشمیر کے متعلق ان تمام کہانیوں کو جمع کر دوں۔ جو کشمیر کے سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے موجودہ صورتِ حال کے ارتقائی پہلوؤں کو اجاگر کرنے

میں ممد و معاون ہو سکیں۔ یہ انتخاب اسی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ اس انتخاب میں میں نے کشمیر کے متعلق انھیں کہانیوں کو اسی ڈھنگ سے پرکھا ہے۔

سب سے پہلا افسانہ جو میں نے لکھا وہ کشمیر کی زندگی کے متعلق تھا۔ دوسرا اور تیسرا افسانہ بھی کشمیر سے متعلق ہے۔ یہ افسانے عوام میں بہت مقبول ہوئے اور اسی مقبولیت نے میری ہمت بندھائی کہ میں آگے چل کر کشمیر کے موضوع پر بہت کچھ لکھ سکوں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مقبولیت اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے حسن کا بیان و اظہار ان افسانوں میں بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں کشمیری فطرت اور کشمیری عوام کے حسن سے بیحد متاثر ہوا ہوں اور میں نے شروع کے افسانوں میں یہ پوری کوشش کی کہ یہ حسن اور اس کی ساری روح کھینچ کر میرے افسانوں میں منتقل ہو جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ان نظر فریب نظاروں کے اندر وہ بدصورتی اور ظالمانہ اذیت کوشی بھی ملی جس کا اظہار اگر میں جا بجا اپنے افسانوں میں نہ کرتا تو شاید ان افسانوں میں وہ زندگی اور حرکت نہ ملتی جس نے عوام کو اس قدر متاثر کیا۔ فن کے حسن کا راز حسن کے بیان میں نہیں ہے۔ حسن اور بدصورتی کے تقابل میں ہے۔ اس کش مکش میں ہے جو ایک خوبصورت اور حسین ماحول اور جاگیرداری نظام کی پیدا کی ہوئی غلاظت کے عیوب سے عبارت ہے۔

میرے بچپن کی حسین زریں یادیں اور جوانی کے بیش قیمت لمحے کشمیر سے وابستہ ہیں، میں کشمیر میں بہت گھوما ہوں، ہینوں کسانوں کے گھروں میں رہا ہوں۔ اُن کے ساتھ رہ کر میں نے

عام انسانوں کی خوشیاں اور اُن کے غم دیکھے ہیں۔ ان کی غریبی اور جہالت کو چکھا ہے۔ اور ان کی اوہام پرستی کا بوجھ اٹھایا ہے، ان کی فراخ دلی اور ہمسائیگی کو محسوس کیا ہے، فطرت سے انھیں جو شاعرانہ پیار ہے اس کے لطیف ترین لمس نے میری روح کو چھوا ہے۔ اور یہاں مجھے اس بات کا اقرار بھی کرنا ہے کہ اگر میں یہ سب کچھ اتنے قریب سے نہ دیکھتا تو شاید میں بہت عرصے تک انسان کی عظمت اور اس کی بلندی سے ناآشنا رہتا۔ شاید میں کبھی افسانے نہ لکھتا، شاید میرے دل میں اپنے وطن اور اس کے لوگوں کے لئے محبت اور وفا کا وہ جذبہ پیدا نہ ہوتا، جس کے بغیر انسان انسان نہیں بن سکتا، یہ بالکل صحیح ہے کہ میرا فن عوام کی دین ہے، میرے شعور کا سرچشمہ ہی محنت کش عوام ہیں، جنھوں نے مجھے سماجی شعور کی الف، بے، تے سے آگاہ کیا، عوام کے بغیر کوئی فن نہیں ہے، کوئی افسانہ نہیں ہے، زندگی میں خوب صورتی اور سچائی اور دیانت اور پاکیزگی اور سربلندی عوام سے آتی ہے۔ اس معاملہ میں میں عوام ہی کو اپنا استاد سمجھتا ہوں، اور انھیں کے آگے عزت و احترام سے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

جب میں نے آنکھ کھولی تو کشمیر پر جاگیردار کا دیو اپنے خونی پنجے گاڑے پوری طرح مسلط تھا، میں نے اپنی ان آنکھوں سے ڈوگرہ راج کی سفاکیوں کو دیکھا ہے۔ کس طرح ہل چلاتے ہوئے کسان اپنے کھیتوں سے گھسیٹ کر بیگار پر بھیج دئے جاتے تھے۔ کسان گھر سے اپنے کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے آیا ہے۔ اور دوسرے لمحے ہی وہ وہاں سے غائب ہے

اور دس دن تک اس کے بیوی بچّوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے، کدھر گیا ہے، زندہ ہے کہ مر گیا ہے۔ کھیتوں میں چلتے چلتے اچانک رک جانے والے بیل کسانوں کی کسی منزل کا سراغ نہیں دیتے تھے۔

میں نے ایسے جاگیردار بھی دیکھے ہیں، جو کشمیری کسانوں کے گاؤں میں پہنچتے ہی سارے گاؤں کے مرد عورتوں اور بچّوں تک کو بندھوا کر اپنے سامنے میدان میں ان کی پٹائی کراتے اس کے بعد مردوں کو رات رات بھر درختوں سے باندھے رکھتے اور خوبصورت عورتوں کو بلاتمیز مذہب و ملت اپنی اور اپنے دوستوں اور اہل کاروں کی ہوس کا نشانہ بناتے، اس میں ہندو، مسلمان، سکھ عورتیں سبھی شامل ہوتیں، ہاں مسلمان عورتیں زیادہ تعداد میں ہوتیں کیونکہ کشمیر میں مسلم عوام پچانوے فی صدی اکثریت میں ہیں۔ صرف ڈوگرہ گھروں کو چھوڑ دیا جاتا۔ کیونکہ ڈوگرے بالعموم جاگیردار ہوتے تھے۔ لیکن جموں اور ادھم پور کے علاقے میں جو ڈوگرے جاگیردار نہیں تھے بلکہ معمولی کسان تھے، وہ شاہی نظام حکومت سے وابستہ ہونے کے بعد بھی اسی طرح غریب تھے۔ اور ان کی عورتوں کی عصمت کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا تھا جو جاگیرداری دور میں دوسروں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا، چاہے وہ حیدرآباد کی مسلم جاگیرداری ہو، یا کشمیر کی ہندو جاگیرداری، ان کا طنطنہ، نشہ، طرزِ عمل، سماجی یگانگت، ظلم کرنے کا دستور بالکل ایک سا ہے۔ یہ مذہب کو عصمت دری کے لئے استعمال کرتے ہیں، پاکیزگی نفس کے لئے نہیں، مجھے حیرت ان ادیبوں پر ہوتی ہے جو آج بھی اس صورتِ حال کو جائز سمجھتے ہیں، اور اس کی حمایت کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے۔

کشمیری عوام انگریزی سرکار سے خریدے گئے تھے ۔ اس لئے ڈوگرہ شاہی جاگیردارانہ نظام حکومت میں ان زرخرید غلاموں کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی ۔ ان کی بیوی بچوں، بہو، بیٹیوں کی اپنی کوئی عزت نہیں تھی، ان کے کھیت اپنے نہیں تھے ان کی اپنی محنت اپنی نہیں تھی، یہ نظام ظلم وتشدد پہ قائم تھا ۔ اس نظام کو قائم رکھنے والے ڈوگرے اہلکار تھے ۔ ڈوگرہ فوج تھی اور پنجابی ہندو مسلمان پنجابی اہل کار تھے، اور ہندو بنئے تھے اور مسلمان خوجے تھے ۔ اور یہ بنئے اور لالے اور خوجے ڈوگرے اور پنجابی اہلکار دونوں مل کے غریب عوام کو لوٹتے تھے اور جب کبھی عوام بغاوت کرتے تو ڈوگرہ فوج ان کے سر کچلنے کو ہمیشہ تیار رہتی ۔ یوں تو ہر سال جب اہل کار لوگ دورہ کرتے یہ ظلم وتشدد ہوتا رہتا تھا ۔ پکے ہوئے پھل، پکی ہوئی عورتیں، پکی ہوئی فصل ہر شئے پہ جاگیرداری کا لگان تھا ۔ مالیہ محصول ۔ چنگی، نذرانہ، اور سود تھا، اور یہ سود در سود بڑھتا چلا جارہا تھا اس پہ بھی محنت کرنے والا کسان زندہ تھا ۔ وہ محنت کرتا تھا اور لڑتا تھا ۔ پھر بھی زندہ تھا اور لڑائی کرتا تھا ۔ مار کھاتا تھا اور مار سہتا تھا، پھر بھی لڑتا تھا ۔ رک رک کے لڑتا تھا ۔ سہم سہم کے لڑتا تھا ۔ مگر داؤ لگنے پر کوئی وار خالی نہیں جانے دیتا تھا، یہ لڑائی اکثر انفرادی اور غیر منظم ہوتی ۔ مگر ہوتی ضرور تھی، وہ لڑتا تھا اور گیت بھی گاتا تھا ۔ اور جہاں تک ہوسکے اپنے بیوی بچوں اور بہو بیٹیوں کی حفاظت بھی کرتا تھا، اکثر ناکام رہتا ۔ کبھی کبھی کامیاب بھی ہوجاتا ۔ میرے شروع کے افسانوں میں آپ کو ان انفرادی لڑائیوں کا سراغ ملے گا اس کی مجبوریوں اور ناکامیوں کا تذکرہ بھی بہت ہوگا ۔ اور جھنجھلاہٹ اور مایوسی اور کچلی ہوئی

زندگی پہ رحم اور نرمی کا جذبہ بھی فروزاں صورت میں ملیگا ۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب دھیرے دھیرے کشمیری عوام منظم ہونے لگے اور اپنے موجودہ رہنماؤں کو سیسہ بنا کے آگے چلے ۔ اس زمانے میں انہوں نے بڑی بے جگری سے اپنی آزادی کی لڑائی اور کئی مورچے فتح کر لئے، شروع شروع میں انھیں ظلم وتشدد کے کوڑے وار سہنے پڑے ۔ یہ تحریک بڑی سختی سے دبا دی گئی یا فرقے داری آگ میں جھلسا دی گئی ۔ لیکن دراصل یہ تحریک فرقے داری تحریک نہیں تھی، کچلے ہوئے عوام کی اقتصادی اور تہذیبی اور سیاسی زندگی کو بہتر بنانے اور اسے سنوارنے کی تحریک تھی، اس لئے فرقہ داری آگ بھی اسے جلا نہ سکی اور کشمیری عوام یوں ایک مٹھی کی طرح متحد ہو گئے کہ جاگیرداری نظام جارحانہ کارروائی کے بجائے اپنی مدافعت پہ مجبور ہوگیا ۔

اس دور میں کشمیری عوام نے قریب قریب بیگار کا خاتمہ کردیا، جاگیرداری کے بہت سے محصولات سے خلاصی پائی مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے، کشمیری قومیت کے جذبے کو فروغ حاصل ہوا، ظالم اہل کاروں کی بیخ کنی کی گئی، اور تعلیمی مراعات حاصل کی گئیں ۔ یہ کشمیری کسانوں کے آگے بڑھنے کا زمانہ ہے ۔ میں نے اس دور میں کشمیری کسانوں کے چہرے پر فتح کی لالی دیکھی ہے، انھیں زندگی میں پہلی بار لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے سامنے غرور سے سر بلند کرتے چلتے ہوئے دیکھا ہے پہلے کسان اہل کاروں کو سلام کرتے تھے اور ان کی خوشامد کرتے تھے ۔ اب تو کل اہلکار کسانوں سے ڈرتے تھے اور ان کی خوشامد کرتے تھے ۔ اور

جاگیرداروں نے اپنے چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعوں میں پناہ لے لی تھی اور اب وہ رعایا کو پنڈاروں کی طرح نہیں لوٹ سکتے تھے بلکہ اپنے حصاروں کے اندر دبکے بیٹھے بہتر موقع کی تلاش میں تھے۔ پہلے وہ رعایا کو قید کرتے تھے اب رعایا نے انھیں قید کر دیا تھا۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ نہیں ہوا تھا، لیکن یہ نظام اپنے اوپر عوام کی آہنی بیڑیوں کی دھمک محسوس کرنے لگا تھا۔

اس کے بعد وہ تیسرا دور آتا ہے جب کشمیری عوام نے بساط حکومت الٹنے ہی کو تھے، اور جمہوری راج قائم کرنے جا رہے تھے کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور چند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے انگریزی سامراجیوں سے مل کر اُن کے زیر سایہ ان کی مدد سے، ان کے ہتھیاروں سے اُن کی پشت پناہی میں ملک کو دو حصوں میں بانٹ لیا۔ ایک قومیت کی بنا پر نہیں کیونکہ دونوں ملکوں میں ایک سے زیادہ قومیں رہتی ہیں، ایک زبان کی بنا پر نہیں، کیونکہ دونوں ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں، ایک مذہب کی بنا پر نہیں، کیونکہ دونوں ملکوں میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ رہتے ہیں، ایک نظام حکومت کی تفریق پر نہیں، یہ نہیں کہ یہاں ہندو طرز حکومت ہے اور وہاں خالص اسلامی طرز حکومت، یہ تقسیم خالص سامراجیت کے اصولوں پر کی گئی۔ یعنی یہ تجارتی منڈی میری ہے اور وہ تجارتی منڈی تمہاری، اس خام مال پر میرا حق ہے۔ اس پر تمہارا۔ ادھر بھی سرمایہ دار اور جاگیردار تھے، ادھر بھی سرمایہ دار اور جاگیردار۔ عوام بھیڑوں کی طرح بانٹے گئے اور اس عظیم دھوکے کا نام ہندوستان اور پاکستان کی آزادی رکھا گیا اور عوام کی بڑھتی ہوئی جمہوری تحریک کو جو ۔V ..... کی خاتمہ۔ شرع

ہوئی تھی کھڈے میں ڈال دیا گیا۔ اور ہندوستان اور پاکستان میں بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد خانہ جنگی کو فروغ دیا گیا تاکہ سادہ لوح عوام بھول جائیں کہ ان کا صحیح دشمن کون ہے!

آج کشمیر بھی اسی خانہ جنگی میں مبتلا ہے، جموں کے غریب ڈوگرے اور مسلمان کشمیر کے وادی کے غریب کسان اور علاقے پونچھ، ہند باغ اور پلندری کے غیور فوجی اور کسان اس خانہ جنگی میں مبتلا کر دیے گئے ہیں، ایک طرف پاکستان کی فوجیں ہیں، دوسری طرف ہندوستان کی فوجیں ہیں اور ان کے اوپر اینگلو امریکی سامراج کے محافظ ہیں جو کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے آئے ہیں جس طرح انھوں نے مغربی کوریا اور یونان کی قسمت کا فیصلہ کیا ہے اسی طرح کا فیصلہ وہ آج کشمیر میں کر رہے ہیں۔ کیونکہ کشمیر کی بدقسمتی یہ ہے کہ جس طرح یونان کی سرحد اشتراکی یورپ سے ملتی ہے اسی طرح کشمیر کی سرحد اشتراکی روس سے ملتی ہے۔ اسی لئے بلیوں کو لڑوا دیا گیا ہے اور سامراج بندر کی طرح ترازو پکڑے بیٹھا ہے۔ روٹی خود ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔

لیکن کشمیر روٹی نہیں ہے، وہ تو جیتے جاگتے انسانوں کی سرزمین ہے، وہ لوگ جو محسوس کرتے ہیں، جو کھاتے پیتے ہیں، محبت کرتے ہیں، اپنے ملک سے پیار کرتے ہیں ان لوگوں کو اپنی تقدیر خود بنانے کا حق ہے، اگر سوئٹزرلینڈ ایسا چھوٹا سا ملک یورپ میں آزاد رہ سکتا ہے۔ تو کشمیر ہندوستان پاکستان چین اور روس کے درمیان رہ کر کیوں آزاد نہیں رہ سکتا، کیوں پاکستان اور ہندوستان کے صاحب اقتدار طبقے اس ملک کو اپنے دائرہ اثر میں گھسیٹنے کے لئے تلے ہوئے ہیں کیوں ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں وہاں پر ہیں۔ کیوں لداخ اور گلگت میں مخالف ہوائی اڈے بنائے جا رہے ہیں، کیوں امریکی فوجی افسر کشمیر کی وادیوں اور گھاٹیوں کے نوٹ

لے رہے ہیں۔ کیوں آج کشمیر کے سینے کے اندر بھی وہی سرخ خونی لکیر کھینچی جا رہی ہے۔ جس نے ایک بار پہلے بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لہو کے دریا بہائے ہیں آج کیوں بارہ مولا کے وادی کے لوگ اور ترارکھل کی وادی کے لوگ دونوں کسان کے بیٹے ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی تقدیر غیر ملکی فوجوں کی بمّوں سے سنورے گی اسے تو کشمیر کے کسان کا ہل اور اس کی درانتی ہی جگائے گی۔ آج پشاور کے بازاروں میں اور امرتسر کی گلیوں میں کشمیر کی کنواریاں تیس تیس روپئے میں بکی ہیں۔ ان میں میرے افسانوں کی آنگی بھی ہوگی اور زینی بھی اور بیگماں اور مرجانی اور جمنا اور رادھا اور کھیتری بھی، آج غیر ملکی حملہ آوروں نے میرے افسانوں کا لہو پیا ہے۔ انہیں کوڑے لگائے ہیں، ان کی عصمت دری کی ہے۔ میں کیسے سمجھوں کہ کشمیر کے معاملے میں ان کی نیت نیک ہے۔

دراصل سوال نیت کا نہیں سوال عمل کا ہے اور عوام کے ہاتھوں میں انقلابی قوت کی باگ ڈور تھما دینے کا ہے اس وقت فیصلہ کشمیر کے عوام کے ہاتھ میں نہیں، لیکن بالآخر یہ فیصلہ عوام کو کرنا ہے۔ جب تک کشمیر کے عوام خود ایک ہو کے آگے نہیں بڑھیں گے اور انقلابی قوت اپنے ہاتھوں میں لے کے یہ نہیں کہیں گے ہم اپنے ملک کے خود محافظ ہیں۔ ہمیں کسی کی فوجی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک کی دوستی کی ضرورت ہے۔ ہمیں امریکی اور برطانوی محافظوں کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں لداخ اور گلگت میں فوجی اڈے نہیں چاہئیں پونچھ۔ راولاکوٹ اور بلندری کا کسان بھی اتنا ہی غریب مجبور اور نادار ہے اور اس لئے

اس کی ضروریات بھی ایسی ہیں جو جموں کے غریب ڈوگرے اور اننت ناگ کے دیہاتی مسلمان کی، اس لئے براہِ کرم آپ سب لوگ یہاں سے تشریف لیجائیے، ہمیں آپ کی مطلق کوئی ضرورت نہیں ہے! ہم خود اپنے گھر کا انتظام کریں گے!

اس کے لئے کشمیری عوام کو ایک ہونا ہوگا، خود لڑنا ہوگا اور اس لڑائی میں اپنا تعلق ہندوستان اور پاکستان اور دوسرے ملکوں کی ترقی پسند جماعتوں سے جوڑنا ہوگا، کیونکہ آج کشمیر کی لڑائی دنیا کی ساری ترقی پسند طاقتوں کی لڑائی ہے۔ یہ وہی کھیل ہے جو یونان، کوریا، ویت نام، انڈونیشیا، ملایا اور برما میں کھیلا جا رہا ہے اور چالیں مقامی حالات کے اعتبار سے کہیں کہیں مختلف نظر آتی ہیں۔ مگر داؤ وہی ایک ہے۔ سامراجی لوٹ!

کرشن چندر

آگہی

مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیر رہے تھے اور ان کے قریب چیلیں منڈلا رہی تھیں "چیلیں"؟ اس نے ہانپ کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا، اب کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا، چیلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں، اس نے دل میں سوچا گدھ، کوے، چیلیں، انسان، ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، اسی طرح سوچتا ہوا عالم حیوانات کی خصوصیت کے متعلق مختلف نظریے قائم کرتا ہوا وہ بہت سا راستہ طے کر گیا، کئی جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں، کئی جگہ اونچی گھاٹیاں تھیں، جن کے دامن میں کھڑے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں، مگر جب وہ بادلوں کی چوٹیوں پر پہنچتا، تو بادلوں کا محل یکایک اوپر اٹھ کر آسمان میں معلق ہو جاتا، اس دنیا میں کتنا دھوکا ہے، مسافر کے تخیل نے اب دوسری پگڈنڈی اختیار کی، مہاتما بدھ نے ٹھیک کہا تھا، قدرت ایک سراب ہے۔ اس نے پھر نگاہ اٹھا کر دور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو

دیکھا، سپید، براق، چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے اور چاروں طرف جمنا کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا، اس نے سوچا، ان مرمریں محلوں کو کس شاہجہاں نے بنایا ہے؟ اور کس محبوب کی یاد میں؟

مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دور نکل گیا، اب ہوا میں خنکی سی آگئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں پر صنوبروں کے جنگل کھڑے تھے۔ جن کا گہرا سبز رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا ارغوانی سا ہو رہا تھا، یہ رنگ آخر ہے کیا؟ نیلا، پیلا، سبز، ارغوانی اور پھر ایک ہی قوس قزح میں ساتوں رنگ، یا شبنم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوس قزح، عجیب بات ہے، یہ کیسی دنیا ہے، میں کہاں جا رہا ہوں اور وہ گاؤں ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

وہ کاندھے پر پڑے ہوئے جھولے کو درست کر کے اپنی چھڑی کو زمین پر ٹیک کر راستے میں کھڑا ہو گیا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، خاموشی، گہری خاموشی اور پھر یکایک گھنٹوں کی پرشور صدا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ لاکھوں مندروں اور کلیساؤں کے گھنٹے ایک دم جھنجھنا اٹھے ہیں۔ مسافر کا خیر مقدم کرنے کے لئے ان کی آواز نے وادی کے خاموش طلسم کو توڑ دیا، یہ آواز بڑھ کر فضا میں پھیل گئی، اوپر اٹھتے ہوئے بادلوں سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوئی اور پھر گھوم گھوم کر مغرب کی سمت سے آتی ہوئی معلوم ہوئی مغربی موڑ سے بھیڑوں، بکریوں، گایوں،

بھینسوں، مینڈوں کا ایک ریوڑ نکل رہا تھا۔ مسافر راستہ چھوڑ کر ایک طرف اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

ہا ہش، بلی۔ ہا ہا ہش، ہا ہا، نیلتی۔ ہا ہا، بلی، ہی ہی،

نیلتی اور بلی دو خوبصورت بچھڑیاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں اور بچاری چرواہی کو انھیں ریوڑ کے ساتھ رکھنے میں بہت دقت محسوس ہو رہی تھی نیلتی کبھی بھیڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور انھیں اتنا پریشان کرتی کہ وہ "بے با" "بابے" کرتی ہوئی تتر بتر ہو جاتیں اور سارے ریوڑ کے نظام کو جو کسی تربیت یافتہ فوج کی باقاعدگی کے ساتھ چل رہا تھا توڑ دیتیں، بلی ناچتی کودتی ہوئی بکریوں کے قریب جاتی اور انھیں دھکے مار مار کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھا دیتی، بڑی بوڑھی گائیں اور بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے حقارت سے یہ منظر دیکھتی جاتی تھیں، گویا کہہ رہی تھیں، کر لے، دو دن اور عیش، پھر وہ دن بھی آئے گا جب تیری پچھلی لاتوں کو باندھ کر تیرا دودھ دوہا جائیگا، اس وقت اچھلنا، پھر تیری چال بھی ہماری طرح بے ڈھنگی ہو کر رہ جائے گی۔ اب جی بھر کر مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھر لے۔"

نیلتی اچھلتی ہوئی مسافر کے قریب آگئی، اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی خوش آئند آواز اس کے ناچتے ہوئے قدموں کے لئے گھنگھروؤں کا کام دے رہی تھی، پھر اپنے اگلے پاؤں ٹیلے پر ٹیک کر وہ مسافر کے پاؤں سونگھنے لگی جیسے جنگل

میں گھاس کے کسی خوشے کو سونگھ رہی ہو، "نیلتی ہا!" چرواہی نے اپنی پتلی آواز میں چلا کر کہا، اس کی آواز بھی ایک گھنٹی سے مشابہ تھی مگر حسین نیلتی نے کوئی پروا نہ کی، شاید شوخی سے، یا شرارت سے، بچاری چرواہی کو تنگ کرنے کے لئے وہ مسافر کا بوٹ چاٹنے لگی

"نیلتی ہا ہا ہش، نیلتی ہی!" وہ پھر چلائی

چرواہی مسافر کے بالکل قریب آگئی، اور سونٹے سے نیلتی کو سزا دینے لگی، بچاری تنگ آگئی تھی، چہرے پر پسینہ کے قطرے تھے اور گال بھی غصے سے تمتمائے ہوئے تھے، نیلتی کو پرے ہٹا کر اس نے نڈر نگاہوں سے مسافر کی طرف تاکا" راہی کو کو؟ دراہی۔ راہرو کدھر جا رہے ہو اس نے پہاڑی زبان میں مسافر سے پوچھا

مسافر مسکرا دیا۔ پھر کہنے لگا یہ نیلتی کتنی شریر ہے

چرواہی کے چہرے سے ترشی جاتی رہی، وہ نیلتی کی طرف جو کمبخت مار کھا کر بھی ناچتی بھاگتی ہوئی جا رہی تھی، پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "ہاں ابھی تین سال بھی اس کی عمر نہیں۔"

"ہم ـــــ اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

چرواہی نے ایک لمحہ کے لئے مسافر کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحہ میں اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا، اس نے منہ پھیر لیا، اور ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی، وہ گایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار رہی تھی

مسافر ٹیلے سے اتر کر چرواہی کے ساتھ ہو لیا، اور اس کا سونٹا چھین کر کہنے لگا

"معلوم ہوتا ہے آج تمھارا بڑا بھائی تمھارے ساتھ نہیں آیا جبھی تو ریوڑ چرانے میں تمھیں اتنی تکلیف ہوئی ہے۔ اب دیکھو میں ریوڑ سنبھالتا ہوں، اور تم ایک شریف ننھی لڑکی کی طرح میرے پیچھے چلی آؤ، میں تھکا ہوا ہوں مجھے بہت دور جانا ہے سورج غروب ہونے کو ہے، کتنی دور ہے تمھارا گاؤں' یہ ہم واپس کدھر جارہے ہیں؟"

چرواہی نے ہنستے ہوئے کہا۔ گاؤں تو تم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اسی لئے واپس جارہے ہو، دیکھو نا، اس گھاٹی کے قریب (انگلی اٹھاکر) وہ رہا ہمارا گاؤں،

"کیا نام ہے؟ ــ ــ"

چرواہی نے جلدی سے جواب دیا" سارو"

مسافر نے چرواہی کی طرف دیکھ کر کہا "میں کہنے کو تھا تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا ــ میرا نام آنگی ہے (آنگی نے رکتے رکتے جواب دیا) ــ تم کہاں سے آرہے ہو ــ ؟"

مسافر نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، زور زور سے ریوڑ کو آوازیں دینے میں مصروف ہو گیا۔

"ہش ہاہا، نیلی ہا، آنگی ہاہا، بلی آہا،

آنگی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی، اچھا تو گویا میں بھی ایک بھیا ہوں۔ اوہو ــ میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گی۔ یہ راہی کتنا عجیب ہے .. ہاہا ... تم تو ریوڑ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے، ادھر لاؤ سونٹا!"

اور چرواہی نے ہنستے ہنستے مسافر سے سونٹا چھین لیا۔

مسافر کو سارو گاؤں بہت پسند آیا، بس کوئی بیس پچیس گھر تھے، سپید مٹی (کھریا) سے پُتے ہوئے، ناشپاتیوں، کیلوں، اور سیبوں کے درختوں سے گھرے ہوئے، سیب کے درختوں میں پھول آئے ہوئے تھے، کچی سبز ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں اور کھیت مکّی کے پودوں سے ہرے مخمل بنے ہوئے تھے، کیلوں کے ایک بڑے جھنڈ کے آغوش میں گنگناتا ہوا نیلا جھرنا تھا اور اس سے پرے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے وسط میں شہتوت کا قدآور درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا، اس کا سایہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ پرے اور نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے تک پہنچ رہا تھا۔ ندی چھوٹی سی کسی نازک پتلی سی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی شمال مشرق کے برفیلے پہاڑوں سے آرہی تھی، اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ نظر کے آخری نقطے پر وہ دو پہاڑوں کے پتلے کناروں سے گذرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جہاں اب سورج چمک رہا تھا، اس کے پرے مسافر کا دیس تھا۔ وہ وہاں کب واپس جائیگا کیا وہ کبھی واپس جاسکے گا؟ یہاں کتنا سکون ہے۔ آرام، زندگی، موت، تینوں نے مل کر یہ خوش نما وادی سی بنا ڈالی ہے۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے ریل گاڑی کے گھومتے ہوئے پہیے اچھلنے لگے۔ یہ کیسا شور ہے' یہ انسان موت سے بھی بڑھ کر" خاموشی" سے کیوں اتنا ڈرتے ہیں۔ ہر وقت شور مچاتے ہیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں، کس لئے؟" یہاں کتنا سکون ہے، امن، حسن، راحت، نیچے پگڈنڈی پر، ندی کے کنارے سے آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھتی ہوئی

آرہی تھی، کاندھے پر پتلی سی سونٹی تھی، لبوں پر ایک بے معنی سا گیت، پاؤں ننگے تھے لیکن چال پر ایک خاموش موسیقیت کا شبہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنی کتاب بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، کاش وہ مصوّر ہوتا، کتنی خوبصورت تصویر ہے، کتنا دلکش پس منظر، آنگی کے سڈول مگر مضبوط بازو اسکی کمر کا تناسب خم، اچھا تو وہ سنگ تراش ہی ہوتا، دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں، ورنہ وہ ایک مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم گر بھی ششدر رہ جاتے، اتنے میں آنگی نے اسے دیکھ لیا عجیب بات ہے، وہ کیوں ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ہے، اس کے لبوں پر بے معنی گیت کیوں رک گیا ہے، وہ سونٹی سے زمین پر کیا لکھ رہی ہے، اَن پڑھ آنگی۔

مسافر نے زور سے آواز دی۔ "آنگی!"

آنگی نے ضرور سن لیا ہے مگر اُس نے جواب کیوں نہیں دیا، وہ اب اوپر چڑھ رہی ہے گھاٹی کے بیچ در بیچ راستے سے گزرتی ہوئی ادھر آرہی ہے، مگر اب اس کی چال مختلف ہے، بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے، اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے، یہ اب ایک نئی تصویر ہے، ایک نیا مجسمہ ہے، وہ جنگل کی دیوی تھی تو یہ دوشیزہ صحرا ہے، اس مجسمہ کی تراش نرالی ہے، اس تصویر کا رنگ نیلا ہے، اس گیت کی لے اونچی ہے، کاش وہ مغنی ہی ہوتا۔

آنگی گھاٹی پر چڑھ آئی، وہ مسافر کے قریب بیٹھ گئی، اور سونٹی کو سبز دوب پہ رکھ کر ستانے لگی، مسافر اس کی زلف کی طرف دیکھنے لگا۔ جو آنگی کے رخ پر

اتر آئی تھی، یکایک آنگی بول اٹھی "تم واپس کب جاؤ گے راہی، جب تم اپنا نام نہیں بتلاتے تو پھر میں تمھیں راہی ہی کہوں گی، ٹھیک ہے نا؟"

مسافر نے کتاب کے ورق الٹتے ہوئے کہا، ٹھیک ہے اور پھر راہی کوئی اتنا برا نام بھی نہیں، بات اصل میں یہ ہے آنگی، کہ میں یہاں اپنی صحت کو بہتر بنانے آیا ہوں۔ جب اچھا ہو جاؤں گا چلا جاؤں گا۔"

آنگی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔ "کدھر جاؤ گے"۔

مسافر نے نہایت بے پروائی سے داہنا بازو اٹھا کر کہا۔ "ادھر جاؤں گا"۔

"تم کہاں سے آئے ہو"۔

اس دفعہ مسافر نے دوسرا بازو پھیلا کر کہا۔ "اُدھر سے آیا ہوں"۔

آنگی کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں، رکتے رکتے کہنے لگی۔ "راہی۔ تم۔۔ کتنے عجیب ہو!"

اور راہی دل میں سوچنے لگا "کیا واقعی میں عجیب ہوں، کیا یہ منظر عجیب نہیں یہ خواب کی سی خاموشی، یہ موت کی سی زندگی، یہ آنگی کے رخ پر بل کھاتی ہوئی زلف، کیا یہ سب عجیب نہیں! آنگی کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے اور اس میں درجنوں پیوند لگے ہیں، مگر وہ کس شان سے گردن اونچی کئے ندی کی طرف دیکھ رہی ہے، جس کے پانی کا رنگ اس کی آنکھوں کی طرح ہی نیلا ہے کیا یہ عجب بات نہیں، آنگی کے ہاتھ کتنے مضبوط نظر آتے ہیں لمبی مخروطی، مضبوط انگلیاں

جوہل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہوں گی، ان کلائیوں نے غالباً کبھی چوڑیوں کی کھنک نہیں سنی، کس قدر عجیب بات ہے، مگر خود میرے ہاتھوں میں نسائیت کی جھلک نمایاں ہے اور ایک چاقو سے اپنا قلم درست کرنے میں مجھے اتنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جتنا آنگی کو آدھے کھیت میں ہل چلانے کے لئے۔

کئی دنوں کے وقفے کے بعد مسافر کی آنگی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا آنگی تمھیں اتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔

آنگی نے جواب دیا" عجیب بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم۔ . . . اتنے دن کہیں غائب رہے۔ اب .. .. بہت دن ہوئے تم نے وہ اپنی تاروں والی بنسری (وائلن) نہیں سنائی۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے ہم سب منو کے نیچے بیٹھے ہوئے فیروز سے الغوزہ سن رہے تھے تمھیں پتا ہے نا' وہ الغوزہ بہت ہی اچھا بجاتا ہے، کرن کہنے لگی پتہ نہیں، کیوں آج کل راہی دکھائی نہیں دیتا، اس سے اس کی تاروں والی بنسری بجانے کو کہتے۔ کیوں؟ اتنا کہہ کر آنگی نے مسافر کی طرف دیکھا۔

مسافر کی انگلیاں بے چین ہو گئیں، اس نے اپنا ہاتھ آنگی کے ہاتھ کے اتنا قریب رکھ دیا کہ ایک کی انگلیاں دوسرے کو چھو رہی تھیں، آہستہ سے بولا ہاں، درست ہے، میں آج کل لمبی لمبی سیریں کرنے کے لئے گاؤں سے بہت دور نکل جاتا ہوں، کبھی کبھی ان صنوبروں کے گھنے جنگلوں میں چلا جاتا ہوں۔"

"تمھارا اکیلے جی کیسے لگتا ہوگا۔"

اکیلا تو نہیں ہوتا، کبھی کوئی کتاب لے جاتا ہوں، کبھی کچھ لکھتا ہوں، کبھی اپنی تاروں والی بنسری بجاتا ہوں۔"

آنگی نے حیرانی سے مسافر کی طرف دیکھا۔ "راہی تم کتنے عجیب ہو"۔ اس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔

برسات کے آخری دنوں میں مکی کی فصل پک گئی، سارو گاؤں والوں نے منو کے درخت کے آس پاس بڑے بڑے کھلیان لگائے، مکی کے کھلیان اور پیلی پیلی گھاس کے ذخیرے منو کے قریب ہی تین چار جگہوں پر پتلی سی چھوٹی خودرو گھاس کو چھیل کر گول گول قطعے تیار کئے انھیں گوبر سے لیپ دیا پھر ان پر کھریا مٹی پھیر دی۔ اب ان میں مکی کے بھٹوں کے انبار جمع کئے اور ان پر بیلوں کو چکر دے دے کر چلایا تاکہ دانے بھٹوں سے الگ ہو جائیں، کچھ بھٹے تو اس طرح سے بالکل صاف ہو گئے۔ مگر بہت سے بھٹے سخت جان نکلے اور بیلوں کے پاؤں تلے روندے جاکر بھی انھوں نے مکی کے دانوں کو اپنے جسموں سے الگ نہ کیا، پھر سارو گاؤں والوں کی ٹولیاں بنی، لوگ چاندنی راتوں کو اکٹھے ہو کر قطعوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بھٹوں سے دانے الگ کر رہے ہیں، نیچے بہتی ہوئی ندی کا دھیما سا شور ہے، منو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور رات بھی اداس نغمے کو سن رہا ہے، جو نوجوان کسان ان کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں

پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں، خاموشی سے مکی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں ہوا کے نہایت ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں اور متو کا سارا درخت سانسیں لیتا ہوا معلوم ہو رہا ہے، کوئی آگ تاپتا ہوا بوڑھا کسان آہستہ سے کہہ اٹھتا ہے اور گاؤ بٹیوا اور گاؤ، پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا، اسے اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کی بہار یاد آ رہی ہے، زور زور شعلوں کی چمک اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرز لرز جاتی ہے، گاتے گاتے گیت کے الفاظ اس کے منہ میں لڑکھڑا جاتے ہیں اب وہ چپ ہو جاتا ہے، اور آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر مکی کا ایک بھٹا بھون رہا ہے۔ نوجوان چرواہیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی یکایک ہنس پڑتی ہیں۔ نوجوان گڈریے انھیں کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں، پھر کوئی ہجر کا نغمہ فضا میں گونج اٹھتا ہے، نوجوان چرواہیوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کر رہے ہیں، یہ مکی کے دانے کسی تسبیح کے بیشمار دانے ہیں، وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے اس آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے، جس کا دھواں اٹھ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے، یہ نیک نفس روحیں ہیں، یہاں ابدی سکون ہے اور قدرت کا رحم!

سارے گاؤں والے مسافر کو ایک عزیز مہمان بلکہ اپنا بھائی سمجھتے اور آ

اپنی خوشیوں میں شریک کرتے، بھولے بھالے کسان، الھڑ چرواہیاں ننھے ننھے بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے، مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ، مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ۔ آنگی اس کے شانے پر اپنی بانہہ ٹیک دیتی اور دوسری بانہہ سے اس کی انگلیوں میں مضراب کو پکڑ کر کہتی، لو بجاؤ راہی! اپنی تاروں والی بنسری بجاؤ، یا پھر کھلیانوں کے لمبے لمبے سایوں میں کوئی اس سے کسی کہانی کی فرمائش کرتا، اس دنیا کی کہانی جہاں لمبے لمبے میدان ہیں، بڑے بڑے دریا ہیں، میلوں تک پھیلے ہوئے شہر ہیں جہاں لوہے کے تاروں پر لکڑی کے مکان قطار بنائے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں، کہیں سے کوئی ایک بٹن دبا دیتا ہے۔ لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر اڑن کھٹولے گھوم رہے ہیں اور نیچے بازاروں میں وہ پریاں محو خرام ہیں۔ جن کے لباس تیتریوں کے پروں سے بنائے گئے ہیں۔

اس طرح مکی کے کھلیانوں میں کئی چاندنی راتیں گذر گئیں، ایک رات مسافر نے پہلے قطعہ میں فیروز کا الغوزہ سنتے ہوئے محسوس کیا کہ آنگی وہاں نہیں ہے۔ دوسرے قطعہ میں مکی کے دانوں کو بھٹوں سے الگ کرتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر آنگی کہیں نظر نہ آئی۔ تیسرے قطعے میں مسافر نے ایک دلکش کہانی سنائی، جو شہروں کی زندگی کے متعلق تھی۔ اس کی نگاہیں آنگی کو تلاش کرتی رہیں، مگر بیسود، چوتھے قطعے میں اس نے اپنی دامن کو نکالا

اور ایک دلسوز نغمہ چھیڑا، باقی قطعوں سے اٹھ کر سارو گاؤں والے چوتھے قطعے میں آ جمع ہوئے اور مسافر کی بنسری سننے لگے، ان کے چہروں پر خوشی تھی اور حیرت بھی ۔۔۔ مگر آنگی کہاں تھی ۔

آخر مسافر نے پوچھ ہی لیا

ایک نوجوان کسان نے بے پروائی سے کہا، "وہ کھلیان کے اس طرف بیٹھی ہے ۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا اپنی ہجولیوں میں بیٹھی گا رہی تھی کہ فیروز کی بہن نے نہ جانے اسے کیا کہا ۔ کیوں دل شاد تم نے کیا کہا کہ وہ اٹھ کر چلی گئی ۔ اور جھولی میں بہت سے بھٹے بھر کرلے گئی، اب اکیلی بیٹھی دانے الگ کر رہی ہوگی ۔ کرن تنا بیٹھی ہے ۔ کرن تو کیوں نہیں جاکر منا لاتی اسے

کرن ہنس پڑی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا ۔

کھلیان کی دوسری طرف مسافر نے دیکھا کہ چند مکی کے بھٹے زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب کھلیان کا سہارا لئے ہوئے آنگی نیم دراز حالت میں پڑی ہے، آنکھیں نیم وا ہیں اور چاندنی کرنوں نے اس کے سر کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے ۔

آنگی !

آنگی !!

آنگی !!!

مسافر آنگی پر جھک گیا ۔ اس نے آنگی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا

کیا بات ہے آنگی ؟"

آنگی اٹھ بیٹھی ۔ اس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا ۔ اور مکی کے دانے الگ کرنے لگی ۔

آخر اس نے گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا ۔ "آہ مسافر مجھے یہاں سے لے چلو

یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا، اور چپ چاپ رونے لگی ۔

مسافر خاموشی سے مکی کے دانے الگ کرتا رہا، اس نے آنگی کے آنسو نہیں پونچھے، اس نے اسے پیار نہیں کیا، یکایک ایک پرندہ اپنے پیاہ پر پھیلائے ہوئے تیر کی طرح سامنے سے نکل گیا ۔ کھلیان کے اوپر دو تین تارے چمک رہے تھے، آنگی کے آنسوؤں کی طرح، اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دلہن کی سسرال کو روانگی کا گیت گا رہی تھیں ۔ مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے صنوبروں کے جنگلوں کو چیر کر وسیع میدانوں کو ڈھونڈھنے لگیں ۔ جہاں اس کا دیس تھا ۔ اس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیئے اچھلنے لگے ۔

مسافر خدا کا شکر بجا لاتا ہے، کہ وہ اپنی دنیا میں واپس آگیا، اپنی

تہذیب کی دنیا میں، کبھی خیال کرتا ہے۔ شاید میں نے غلطی کی، کبھی کبھی اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے بیٹھے خوش نعلیاں کرتے ہوئے اس کے کانوں میں عجیب عجیب الفاظ گونجنے لگتے ہیں، راہی تم کتنے عجیب ہو راہی، حتیٰ کہ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے، اور وہ سوچتا ہے کہ شاید کسی نیلے جھرنے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے، اس کے پاؤں ننگے ہیں، اس کی نگاہیں اداس ہیں، اس کے بالوں میں سیب کے پھولوں کا گچھا ہے۔

آگی!

جہلم میں ناؤ پر

گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تمازتِ آفتاب نے اور بھی حبس پیدا کر دیا تھا، میں درمیانے درجے میں بیٹھا ہوا تھا اب لاری والوں نے بھی ریلوے کی طرح مختلف درجے بنا دیئے ہیں) اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ کوئی موٹر نہ ملی ورنہ راستہ آسانی سے طے ہو جاتا، یوں بھی تمام لاری میں وابستگی کا کوئی سامان نہ تھا میرے دائیں طرف کی طرح طرّہ پھیلائے ہوئے ایک تھانیدار صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ جو بار بار مونچھوں کو تاؤ دیئے جاتے تھے۔ سب سے آگے اول درجے کی نشست پر یعنی ڈرائیور کے بالکل قریب ایک تحصیل دار صاحب جلوہ افروز تھے جن کی خنداں پیشانی اور ڈھیلے صافے سے ان کے دلی طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لئے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی۔

وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں بچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے نائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر آہ اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی منزل پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا ہول بردا شتہ چہرے تھا در تھے یا پھر تھانیدار صاحب کا موڈ چھل۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حسن ناپید ہے، دوسرے لمحہ میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کم عمر بد صورت عورت اپنے چھوٹے بچے پہ جھکی ہوئی اسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی۔

اس نے اپنی سانولی پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھ کر گھٹتے ہوئے لہجہ میں کہا "آہ میں کس قدر تھک گئی ہوں، میرا سانس گھٹا جاتا ہے"۔

بیچاری غریب عورت! میرا مطلب یہ ہے کہ گو وہ ریشم میں ملبوس تھی اور بجید بد صورت تھی، پھر بھی عورت خطرناک غریب اور کمزور ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹے بچے کو اپنے زانوں پر لے لیا۔

عورت نے احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر قے کرنے لگی۔

عشق کی مجبوریاں، ناچاریاں، میں نے جلدی سے منے کو تھانیدار صاحب کی

آغوش میں دھکیل دیا اور خود اٹھ کر ڈرائیور سے لاری ٹھہرانے کے لئے کہا۔

ڈرائیور بولا۔ "سرکار یہاں لاری ٹھہرانے سے کیا فائدہ، بس گاٹیالیاں کا گھاٹ کوئی پون میل رہ گیا ہے، وہیں ٹھہراؤں گا، کسٹم کی چوکی پر، دریا کے کنارے، دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے ان کی طبیعت راس ہو جائے گی۔

چنانچہ یہی ہوا

گاٹیالیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریائے جہلم بہتا ہے۔ اس لئے شہر جہلم کو جانے کیلئے گاٹیالیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ ریاست جموں کو جاتے ہوئے مسافروں کا تانتا، ریاست جموں سے جہلم آئے ہوئے لوگ، اسباب سے لدے ہوئے بیل یا گدھے چنگی پر ٹھہری ہوئی بیشمار لاریاں اور دریا کے کنارے بندھے ہوئے بلے بلے بجرے ایک چھوٹی سی بندرگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں، اسی بھیڑ بھاڑ میں میں نے تھانیدار صاحب تحصیلدار صاحب اور کم عمر بد صورت کو بھی کھو دیا۔ میرا اسباب مختصر سا تھا، اس لئے چونگی والوں سے جلد خلاصی کرا لی اور ایک چھوٹے سے قلی پر اسباب لاد کر میں دریا کی سمت چلا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ سر میں درد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں دریا کے وسیع پانیوں سے ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے، طبیعت صاف ہوتی گئی، اور جب دریا کے کنارے پہنچا ہوں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر اٹھا ہوں۔ لمبی لمبی دریائی گھاس میں جو کنارے پر اگی ہوئی تھی ایک

لطیف خوشبو تھی، جس نے ہمیں نتھنوں کو بیدار کر دیا، جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا، جس پہ چلتے ہوئے بڑے بڑے بجرے اور چھوٹی کشتیاں، ملاحوں کی پرشور راگنیاں اور لمبی لمبی ڈانڈوں کے پانی کے چیرنے کی مدھم آوازیں ایک پرکیف منظر پیش کر رہی تھیں۔

چھوٹے سے دبلے پتلے قلی نے قاؤ کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے میرا اسباب اتار کر رکھا! اسی درخت کی چھدری چھدری چھاؤں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت سا اسباب لئے بیٹھے تھے۔ غالباً کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے قلی کو جیب سے دو انی نکال کر دی اور اس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"عبداللہ"

"تو عبداللہ ہمیں کہیں سے کشتی کا انتظام کر دو۔ دیکھو؟ ضرور"

عبداللہ مسکرا کر کہنے لگا "صاحب ایک کشتی میری اپنی ہی ہے، ٹھہریئے میں اپنے چھوٹے بھائی کو بلاتا ہوں، ہم دونوں آپ کو پار لے چلیں گے۔ ساڑھے تین روپیہ کرایہ ہوگا۔"

جب عبداللہ چلا گیا تو میں نے زمین پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھا، ریت کے بڑے بڑے کاؤ اور رنگ کے درختوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے ماہی خور، پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ کی، لڑکی پیٹھ موڑے دریا کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی اس نے ایک گہرے رنگ کی سبز ساری پہن رکھی تھی جس کا کنارہ سنہری تھا، لڑکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ اور ایک خاکی نکر پہن رکھی تھی، گلے میں ایک خوشرنگ ٹائی بھی تھی، مجھے اپنی طرف مڑتے دیکھ کر

کہنے لگا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہلم کے پار ایک گاؤں ہے وہاں میرا گھر ہے بس وہیں جا رہا ہوں" "اور آپ" میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے جواب دیا "ہم لاہور جا رہے ہیں، میں تو جموں میں تعلیم پاتا ہوں مگر یہ ... میری ہمشیرہ ہیں، لاہور ایف، اے میں تعلیم پاتی ہیں، انھیں پہنچانے جا رہا ہوں، اس سفر میں بہت پریشانی دیکھنا پڑتی ہے۔ اب یہاں ملاح بہت تنگ کرتے ہیں، آدھ گھنٹے سے بیٹھے ہیں کہ کوئی چھوٹی سی کشتی علیحدہ ہمارے لئے مل جائے تو اس میں سوار ہو کر پار چلے جائیں، مگر یہ ملاح لوگ کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی کشتی سرے سے ہے ہی نہیں۔ سب بڑے بڑے بجرے ہیں، جن کے دام بھی بہت مانگتے ہیں ———— آٹھ روپیہ، دس روپیہ، تو دن دہاڑے ڈاکہ ہے۔ کتنی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ گھبرائیے نہیں۔ اب کشتی مل جائے گی میں سب انتظام کئے دیتا ہوں اور ہم آرام سے جہلم پار پہنچ جائیں گے۔"

لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تو یقیناً جھوٹ ہوگا لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اس کے چہرہ میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موہنی تھی جس نے ایک دم مجھے مسحور کر لیا صرف ایک لمحہ کیلئے اس نے میری طرف دیکھا پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھک گئیں وہ کشمیر کے حسن ملیح کا ایک نادر نمونہ تھی، دلکش خدوخال، سرو قد، دلآویز رنگت، لیکن جب چہرے نے

مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اس کی نگاہوں کا حزن و ملال تھا۔ جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا، اف، وہ المناک گہرائیاں، اس ایک لمحہ میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں پھر یکایک مجھے ٹھوکر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا، کس قدر عجیب احساس تھا مگر یہ احساس صرف ایک لمحہ تک ہی محدود تھا دوسرے لمحہ میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف تجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا، ہر قسم کے جذبات سے عاری، میرے دل پر ایک نیم اضطراری کیفیت طاری ہو گئی۔

اتنے میں اور دو مسافر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے، پہلے ایک بوڑھا آدمی سفید ریش لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور "رام رام" کرتا ہوا میرے نزدیک بیٹھ گیا، پھر بچہ اٹھائے ہوئے دبلی کم عمر بدصورت عورت نمودار ہوئی، اس کے ساتھ ایک قلی ٹرنک اور گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھا وہ عورت بھی لڑکی کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور چھوٹا بچہ سبز ساری کے پلو کو کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی آگیا اور کچھ وقفے کے بعد اس کا بھائی کشتی کنارے پر لے آیا۔

عبداللہ نے مجھے مسکرا کر کہا۔ "چلئے کشتی میں بیٹھئے۔"

بوڑھے آدمی نے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے بھی لیچلو بابا۔ رام تمہارا بھلا کرے۔"

بدصورت عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی، کہنے لگی "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی اس کشتی میں بیٹھ جاؤں، مجھے آج گجرات پہنچنا ہے، اگر یہ گاڑی نکل گئی تو پھر... اب شام بھی ہوتی جا رہی ہے اور میں اکیلی ہوں۔"

ہم سب کشتی میں جا کر بیٹھ گئے۔ قلیوں نے مال و اسباب کشتی میں قرینے سے رکھ دیا عبداللہ اور اس کے بھائی نے آستینیں اوپر چڑھائیں اور ایک ایک ڈانڈا ہاتھ میں لیکر کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ہو گئے۔

اللہ کا نام لیکر کشتی چلی، عبداللہ نے گانا شروع کیا۔

جس داتاں لیندیاں بیڑا پار دے

ڈاچی والیا موڑ مہار وے

عبداللہ نے رک کر پوچھا۔ "آپ کو میرے گانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

لڑکے نے جلدی سے کہا، "نہیں، نہیں ضرور گاؤ، تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔"

عبداللہ نے پھر گانا شروع کیا۔ وہی "ڈاچی" کا پرانا گیت، جسے گانے کے لئے سوز چاہئے ساز نہیں۔

ایک سانڈنی سوار کو صحرا میں سے گزرتے دیکھ کر ایک اداس حسینہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے اسے رک جانے کو کہتی ہے اور پھر اس سے التجا کرتی ہے کہ تو مجھے سانڈنی پر بٹھا کر میرے بچھڑے ہوئے محبوب سے ملا دے۔

ڈاچی والیا! موڑیں مہار وے

ڈاچی والیا! اے چل تا نال وے

لڑکے نے آہستہ سے کہا۔ "ظالم! بہت اچھا گاتا ہے، کیا سریلا گلا ہے مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ ذرا سنو تو۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بھائی کے شانوں سے سر لگائے ایک طرف بیٹھی تھی، آہستہ سے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے لبوں پر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ آگئی، نہایت آہستہ سے اس نے اپنے بازو چھاتی پر باندھ لئے اور ٹانگیں پھیلا کر نشست پر پرلیٹ گئی، اس طرح کہ میں اس کے نصف چہرے کو دیکھ سکتا تھا، اس کے خوبصورت ہاتھوں کی اس کے نازک ٹخنوں کو۔

میری ڈاچی دے گل وچہ ٹلیاں

میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

عبداللہ کی پر سوز آواز نے میرے جذبات کی سوئی ہوئی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیا۔ میرا دل ایک عجیب لذت و درد کے مزے لینے لگا، یہ کیسی خلش تھی، کیسی ہلکی میٹھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمہ کی لہروں میں کسی مہجور حسینہ کی روح بہتی ہوئی چلی آرہی ہے یا دریائے جہلم کی وسیع چادر آپ ایک صحرا ہے ہماری کشتی "ڈاچی" بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے، روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لئے۔

ڈاچی ———— میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

لڑکی نے چپکے سے ساڑی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اس کے بھائی نے نہیں دیکھا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ کیا ڈاچی کے حسین نغمے نے لڑکی کے دل میں محبت کی دبی ہوئی آگ کو روشن کر دیا تھا، نہیں تو یہ آنسو کیسے؟ میرا دل اس بھید کو جاننے کے لئے بیتاب ہوگیا وہ کس بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد میں رو رہی تھی، میں نے چاہا کہ میں گلاب

کی نرم و نازک پتیوں سے اس کے آنسو پونچھ ڈالوں اور اس سے پوچھوں "بتا اے حسینہ تجھے کیا غم ہے؟"

اس کے بجائے میں نے اس بدصورت عورت کی شرمائی ہوئی نگاہیں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے لجا کر اپنی آنکھیں نیچی کرلیں اور اپنے بچے پر جھک گئی۔

چھلک —— چھلک —— چھلک —— چھلک —— کشتی بھاگی جا رہی تھی، ڈانڈیں باری باری چل رہی تھیں، مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا، دریا میں ڈوب رہا تھا۔ دریا کی سطح پر ایک عجیب نازک، نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی۔ میں سمجھا یہ غروب آفتاب نہیں، نمود سحر ہے، مغرب نہیں، مشرق ہے۔ روشنی کا منبع اعظم ہے ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے۔

"میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں"

چپ —— چپ —— شپ —— شپ —— کشتی بھاگی جا رہی تھی۔

شام ہوگئی اندھیرا بڑھتا گیا، عبداللہ خاموش ہوگیا۔ پھر ایک دلکش انداز سے سفید دودھیا بے داغ چاندنی کھل گئی اور مجھے ڈل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول یاد آگئے۔ کشتی کے چاروں طرف دور دور تک پانی کی ہلکی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنول کے لاکھوں پھول کھل گئے ہیں۔

بوڑھا آہستہ آہستہ "رام رام" جپ رہا تھا بدصورت عورت دزدیدہ نگاہوں سے کبھی

مجھے کبھی خاموش بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیتی تھی" لڑکے نے ایک دو بار اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بچاری نشاما، سفر کی تکان سے چور ہو کر آخر سو گئی ہے یہ سفر کتنا پریشان کن ہے۔"

کیا وہ واقعی سو رہی تھی، یا آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی وہ بالکل بے حس و حرکت ایک مرمریں مجسمہ کی طرح پڑی تھی، یا شاید کسی سپنے کی ٹھنڈی چھاؤں میں ستاروں کی کپکپاتی ہوئی لامتناہی دنیا میں اپنے محبوب سے مل رہی تھی؛ یا پھر اس کی آوارہ روح چاندنی کی کرنوں میں بھٹکی ہوئی کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ ہاں، مگر کس کو؟"

آخر ایک طویل عرصہ کے بعد اس طویل سکوت کو عبداللہ نے توڑ دیا" لو وہ کنارا آگیا" اس نے ڈانڈ کو زور زور سے چلاتے ہوئے کہا۔

کنارے پر پہنچ کر میں نے لڑکے سے کہا "آپ جا کر تانگہ وانگہ درست کریں۔ میں یہاں قلیوں کا انتظام کرتا ہوں۔"

تانگہ والوں کا اڈا کوئی فرلانگ بھر دور تھا، لڑکا تانگے کا انتظام کرنے گیا۔

میں نے عبداللہ سے کہا: "ذرا کہیں سے قلیوں کو تو بلوا دو۔"

عبداللہ کہنے لگا۔ "اب اس وقت یہاں دریا کے کنارے قلی کہاں سے آئیں گے۔"

"تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

"میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ہم دونوں بھائی دو تین پھیرے لگا کر آپ کا اسباب تانگوں پر رکھ دیں۔ چار آنہ فی پھیرا لیں گے۔"

اچھا یونہی سہی اٹھاؤ اسباب اور ان (بدصورت عورت کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اڈے پر لے چلو۔

—— عبداللہ کے آخری پھیرے پر میں نے کشتی میں سوئی ہوئی لڑکی کو جگا دیا۔ "اٹھئے اب تو جہلم کا دوسرا کنارہ بھی آگیا۔"

میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہونے پہ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی" وہ یقیناً سو نہیں رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا رنگ زعفران کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پر دکھی یاس انگیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے بٹوہ سے ایک روپیہ نکال کر کہا ایک روپیہ کا خردہ ہوگا؟"

اس نے ہینڈ بیگ کھول کر پیسے نکالے اور مجھے دیدئے۔ وہ نرم و نازک مخروطی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں۔

میں نے عبداللہ کو انعام دیا۔ اس نے جھک کر ہم کو سلام کیا اور پھر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

ہم خاموش چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے بوڑھا لاٹھی ٹیکتا جا رہا تھا۔ چند قدم چل کر میں نے نشاما سے جرأت کر کے پوچھا۔ "آپ کشتی میں رو رہی تھیں، کیوں؟"

وہ خاموش چلتی گئی، سر جھکائے ہوئے۔

میں نے پھر کہا۔ "میں نے یقین جانئے نہایت دلی خلوص سے سوال کیا ہے میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ اپنا دکھ مجھ سے کہہ سکیں اور میں آپ کے کسی کام آسکوں، کوئی ہرج ہے!"

اس نے غمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر یکایک کچھ سن کر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر ٹھٹک گئی، وہ گرنے کو تھی کہ میں نے اسے ایک بازو سے تھام کر سہارا دیا۔ عبداللہ چاند کی طرف منہ کئے ہوئے گا رہا تھا۔

ساڈی ڈاچی دے گل وچہ ڈھولنا

جھوٹے سجناں دے نال کی بولنا

ڈاچی والیا موڑ لیں۔

آواز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دور پرے جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاند کی سحر فشاں کرنیں پرلرزتی آرہی تھی، انداز بیان میں بلا کی شوخی تھی اور فقروں میں ایک بے پناہ طنز جو دل کو چھید ڈالتی تھی۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ کانپ رہی تھی اور جلد جلد قدم اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس حزیں نغمے کے سیل بے پناہ سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ طوفان جو اس کی بیقرار روح کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

باقی راستہ ہم نے خاموشی میں طے کیا۔

جب میں انہیں تانگوں میں سوار کر چکا تو لڑکے نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، "شکریہ بہت بہت شکریہ ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی" "کیا آپ کا گاؤں یہاں سے نزدیک ہے؟"

"بس کوئی تین چار میل ہوگا، وہ سیدھی پگڈنڈی جا رہی ہے پیدل ہی جانا ہوگا۔"

بدصورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پھر سر جھکایا

میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا دو دفعہ، ایک دفعہ بدصورت عورت کو دیکھ کر، اور آخری بار لڑکی کو دیکھ کر، لڑکی نے میری طرف مبہم خمار آلود ماندہ دگیں نگاہوں سے وہ نگاہیں شاید کھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہو گئی۔ جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے۔ اس کا داہنا بازو تھوڑا سا اوپر اٹھا اور پھر نیچے گر گیا، چوڑیوں کی جھنکار پیدا ہوئی اور پھر ایک لمحہ میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہو گئی۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے اب وہ نظر نیچی کئے ساڑھی کا پلو ٹھیک کر رہی تھی۔

"گڈ بائی" میں نے جلدی سے کہا

تانگا چلنے لگا۔ لڑکے نے زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "گڈ بائی"۔

سیدھی کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی جا رہی تھی، آسمان پر تاروں کے درمیان بھی اسی طرح ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی "یہ سفر کب شروع ہوا؟——

میں سوچنے لگا...... یہ دونوں پگڈنڈیاں کدھر جا رہی ہیں؟...... یہ سفر کبھی ختم ہوگا؟"

حسن اور حیوان

سحر کی اڑتی، گھلتی ہوئی سیاہی اور سفیدی میں وہ ایک چھوٹے سے نالے کے قریب پہنچ گیا اور اپنے کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ نالے میں گھس گیا۔ پانی ایک دو جگہ اتنا گہرا تھا کہ کمر تک آتا تھا، پاؤں کہیں کومل، اور کہیں ملائم ریت اور کہیں نیلے نیلے پتھروں پر پھسلتے معلوم ہوتے تھے۔ شوخ و شنگ مچھلیاں اپنے نقرئی دھڑوں کو ہلاتی ہوئی ادھر ادھر گھومتی جاتی تھیں۔ کئی پتھر پیلے یا دودھی سبز یا سیاہ کائی کی بنی ہوئی تھی اور جب نہاتے نہاتے غیر ارادی طور پر اس کے پاؤں ان پتھروں سے جا لگتے تو اس کے بدن کے رونگٹے رونگٹے میں ایک خاص قسم کی جنسی لذت کا احساس جاگ اٹھتا اور وہ مسرور ہو کر منہ میں پانی بھر کر زور زور سے غلو غلو کرتا اور کلیوں کے چھوٹے چھوٹے فوارے چھوڑتا، ہنستا، گاتا، پانی میں ناچتا اور دونوں ہاتھوں سے چھینٹے اڑاتا، جیسے اس کے سامنے اس کا گہرا دوست یا محبوب کھڑا ہو۔

لیکن نالے میں اس وقت اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ صرف ایک چٹان کے کنارے ایک سرخ رنگ کا کیکڑا اپنی ننھی آنکھوں سے اس کی دلچسپ حرکات دیکھ رہا تھا اور اس کی بوالعجبی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ نالے کے تینوں طرف اونچی اونچی گھاٹیاں تھیں

چوتھی طرف نالہ بہتا ہوا دریائے جہلم میں بہہ جاتا تھا۔ جہلم کے پار مری کے سلسلہ ہائے کوہ پھیلے ہوئے تھے اور ان کے سینے کو چیرتی ہوئی موٹر کی سڑک ایک بڑے اژدہے کی سفید کینچل کی طرح بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، خاموشی مکمل سناٹا، نہ موٹر کی گھوں گھوں نہ چیڑ کے درختوں کی سائیں سائیں۔ نہ گٹاریوں کی کرائیں کرائیں۔ نالے کا پانی تک سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور کہیں کہیں چٹانوں کے قریب پانی کے گزرنے سے ترل رل ترل رل کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ لیکن یہ آواز اتنی مدھم سی معلوم ہوتی تھی کہ سناٹے سے ہم آہنگ معلوم ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے پانی میں غوطہ لگاتا اور پانی میں غوطہ لگاتے ہی آنکھیں کھول دیتا اور چند لمحوں کے لئے اس زیر آب جہانِ رنگ و بو کا تماشا دیکھتا۔ پھر جب اس کا سانس گھٹنے لگتا تو وہ اپنا سر پانی کی سطح کے اوپر اٹھا لیتا اور اس ترل رل ترل رل کی مدھم میٹھی صدا کو سنتا جو یا تو کائنات کی خاموشی کی بازگشت تھی اس کے تیز تیز سانس کی لے یا صبح کے لطیف لبوں کا لمس۔

نہاتے نہاتے جب اسے بدن کے ہر مسام میں برف کی سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور جب نالے کے بیچ پر اڑتے ہوئے بادلوں کے کنارے سورج کے ابھرتے ہوئے سونے سے دمکنے لگے تو اسے اپنے دن بھر کے سفر کا خیال آیا۔ بیس میل کا لمبا سفر اور اسے کل صبح دھلر کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے کا چارج لینا تھا راستہ نامعلوم تھا اور دشوار گذار بھی۔ امید تھی کہ راستہ پوچھ پوچھ کر وہ منزل پر جا پہنچے گا کچھ عرصے کے ذہنی پس و پیش کے بعد وہ نالے سے باہر نکلا۔ جھولے سے تولیہ نکال کر

بدن پوچھا۔ پھر ناشتہ نکالا اور ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر اسے کھانے لگا، روٹی کے ریزوں نے جو بار بار پانی میں گرتے تھے مچھلیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ چٹان کے گرد اس طرح جمع ہو گئیں جس طرح مقناطیس کے گرد لوہے چون کے ذرے، اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ روٹی اس نے سوچا دنیا میں سب سے بڑا مقناطیس ہے، اور اب وہ سرخ رنگ کا کیکڑا بھی اپنے بے شمار ہاتھ ہلاتا ہوا، پانی میں تیرتا ہوا ان ریزوں کی طرف آ رہا تھا۔ بیس میل کا سفر تھا۔ لیکن اس سفر کے آخر میں بھی ایک روٹی کا ٹکڑا تھا جس کی طرف وہ کھنچا ہوا چلا جا رہا تھا، یکایک اسے محسوس ہوا کہ یہ بیس میل ٹہنی کے ایک لمبے تار کی طرح تھے۔ جس کے سرے پر ایک ہک میں روٹی کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ ناشتہ کھاتے کھاتے اس نے اپنے آپ کو اس بے بس مچھلی کی طرح جانا کہ جس کے گلے میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا ہو اور وہ کھانسنے لگا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ اپنے تخیل کی زقند پر، نالے کے منبع پر، بادلوں کا رنگ گلابی ہو گیا تھا اور ان کے پیچھے ایک سنہری سیال ابلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ ابلتا ہوا سیال بادلوں کو پھاڑ کر بہہ نکلے گا۔ اور دن چڑھ جائے گا۔ اسے اب چلنا چاہئے۔

جب وہ چلا تو کیکڑے نے ایک مچھلی کو پکڑ لیا اور اب وہ اپنی چھوٹی آنکھوں سے اپنی شکار کی طرف پُرمسرت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پہلے پانچ میل کی سخت چڑھائی تھی، پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی اوپر ہی اوپر چڑھتی جا رہی تھی، جیسے آسمان کو چھو کر ہی دم لے گی، بیوقوف پگڈنڈی بھلا آسمان کو کون چھو سکتا ہے۔ اسے پگڈنڈی کی اس نامعقول حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اگر وہ آرام سے مزے مزے میں چلتی جاتی تو نہ مسافروں کو تھکن محسوس ہوتی نہ ان کے سانس کی دھونکنی تیز ہوتی نہ ان کا جسم پسینہ میں شرابور ہوتا ——— لیکن اب یہ سب کچھ تھا اور پگڈنڈی تھی کہ برابر اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ آسمان کو چھو لے گی، پگڈنڈی کی یہ خواہش ایک آرزوئے ناتمام کی سی تھی۔ کیونکہ درحقیقت آسمان کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت سراب کی سی ہے جو چیز نہ ہو۔ اسے کیونکر کوئی پا سکتا ہے۔ لیکن پگڈنڈی ——— بہرحال مجھے سستا لینا چاہئے۔ اس نے سوچا مجھے اس پگڈنڈی پر بیس میل چلنا ہے اس پگڈنڈی کے گناہ پگڈنڈی کے مسافروں کو بھی اپنے پیٹ میں لے لیتے ہیں۔ انجیل میں صاف لکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس بھگماڑے کے درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیا جائے۔

وہ پہاڑی انجیر کے درخت کے تنے سے سہارا لگا کر بیٹھ گیا اس درخت کے سامنے انجیر کا ایک اور درخت تھا نیچے ایک گھاٹی تھی جہاں دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں مکئی کے پودے اگے ہوئے تھے ان کے پرے بنچ کی باڑھ تھی اور اس سے پرے وہی نیلا آسمان اور اس میں قمری کے سلسلہ ہائے کوہ اور ان کے سینے کو موڑتی ہوئی موٹر کی سڑک۔ اس نے اس منظر کو دیکھتے دیکھتے یہ معلوم کر لیا کہ یہ سارا منظر نقلی تھا۔ آسمان کی نیلی سطح پر

کسی نامعلوم مصور نے یہ چند آڑے ترچھے نقوش کھینچ دیئے تھے۔ ان میں جان بالکل نہ تھی نہ رعنائی، نہ خوبصورتی، پھر کہیں سے ایک لاری چیونٹی کی طرح رینگتی ہوئی موڑ کی سڑک پہ چلتی نظر آئی۔ آسمان پر چیل اپنے پر تولتی نظر آئی۔ بنج کی باڑھ سے ایک مرد اور ایک عورت باہر نکلتے نظر آئے اور مکی کے پودوں میں گھس گئے۔ سامنے انجیر کے درخت پر دو چڑیاں نظر آئیں اور پھدک پھدک کر ایک دوسرے سے چونچ ملانے لگیں اب ہر طرف حرکت اضطراب۔ جامد تصویر لرزشوں کا مرقع بن گئی تھی۔ خاموشی میں ترنم پیدا ہو گیا تھا۔ آسمان کی نیلی سطح میں سمندر کی سی گہرائی۔ اس نے سوچا مادّے سے حرکت اور حرکت سے تخیل پیدا ہوتا ہے۔ اس پگڈنڈی کے تخیل کی طرف دیکھو۔ اس کی ہمت اس کی جرات، اس کی سعی جمیل کی داد نہ دینا ایک ظلم ہو گا اور ایک میں ہوں کہ آدھ گھنٹے سے یہیں ستانے بیٹھا ہوں اور ابھی تک وہ مرد اور عورت کھیتوں سے باہر کیوں نہیں نکلے۔ شاید کھیتوں کی نلائی کر رہے ہیں چڑیوں نے ہنس ہنس کر کہا چوں چوں چوں۔ یعنی ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔ جاؤ اپنی راہ لو اور ہماری خوشیوں میں خلل نہ ڈالو وہ گھٹنوں کا سہارا لیکر اٹھا اور آگے چل پڑا۔

پگڈنڈی کا رنگ زرد تھا۔ کناروں پر سبز گھاس سرنگوں تھی۔ کہیں کہیں جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے لیکن مرجھائے ہوئے۔ جیسے سفر کی تکان سے چور ہو گئے ہوں۔ جیسے انھیں پیاس لگی ہو اور انھیں پانی دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ آگے بڑھتا گیا اور اس کی پیاس چمک اٹھی۔ پگڈنڈی اب ایک اونچے کھیت کی مینڈھ کے نیچے گذر رہی تھی۔ اس نے

سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نازک اندام بکری کھیت کی مینڈھ پر چرتی نظر آئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بکری نے سر اٹھا کر اک نگاہ غلط انداز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر "اوں ہوں میں میں" کر کے منہ پھیر لیا۔ جیسے کہہ رہی ہو "میاں آگے بڑھو یہاں کوئی پانی وانی نہیں ـــــ میرے تھنوں میں جو دودھ ہے وہ میرے مالک کے لئے وقف ہے"۔

اس نے ٹوپی اٹھا کر کہا "بہت اچھا مادام۔ تمھارا جسم تمھارے خاوند کیلئے ہے تمھارا دودھ تمھارے مالک کے لئے۔ تمھاری روح ہندوستانی عورت کی ہے اس ملک میں پیاسے مسافروں کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں۔ سفر کو اسی لئے یہاں ایک بدعت سمجھا جاتا ہے۔ مسرت نہیں۔ اور کالے پانی پار جانا تو ایک گناہ ہے۔ بہت اچھا مادام یوں ہی سہی۔ معافی چاہتا ہوں۔

پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اور یہ پگڈنڈی ابھی اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ راستہ میں اسے ایک کسان ملا۔ اس نے پوچھا:۔

"بھئی یہاں کوئی پانی کا چشمہ ہے"۔

"ہے تو سہی لیکن یہاں سے کوئی تین میل اوپر چڑھ کر۔

بہت پیاس لگی ہے۔ بھائی کوئی نزدیک چشمہ ہو تو بتا دو بڑا احسان ہو گا"۔

کسان زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی سے بندھی گٹھڑی کو کھولا اور اس میں سے ایک زعفرانی رنگ کی موٹی سی ترتیڑی نکالی خوب رس دار تھی اور تازہ۔ اس نے

اسے پتھر پر توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ آدھی تربوز اسے دے کر کہا: "پہلے تو اس کا رس پی جاؤ بیجوں سمیت، پھر راستے میں اس کی پھانکیں بنا کر کھاتے جانا، اللہ نے چاہا تو تین میل تک اب پیاس نہ لگے گی۔"

کھٹا سا لذیذ رس، جیسے گول گپے بیچنے والوں کے ہاں ہوتا ہے بیجوں سمیت اس کے حلق میں اترتا چلا گیا اور اس کی آنکھوں کی چمک پھر عود کر آئی۔ تربوز کا ایک قتلہ سا اتار کر کھاتے ہوئے اس نے کسان کا شکریہ ادا کیا۔ کسان نے اس سے برادرانہ انداز میں پوچھا: "کہاں جا رہے ہو۔"

"موضع دھریلہ۔"

"ٹھیک یہی راستہ ہے۔"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں کوہاٹ جا رہا ہوں۔ سنا ہے وہاں موٹر ٹرک پہ بوجھ اٹھانے والوں کی ضرورت ہے۔ ابکے فصل کچھ اچھی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔۔"

لگان، رشوت، نمبردار، بچے، بیوی، کسان گٹھری کاندھے پہ رکھ کر پگڈنڈی سے نیچے کی طرف اترتا گیا۔ یہ مقناطیس کی دوسری سمت تھی۔ یا وہی نبی کا کانٹا جو نجات پانے تک زندگی کے حلق میں اٹکا رہتا ہے۔ پیاس بجھ چکی تھی اور وہ تربوز کے قتلے کھا رہا تھا ایک سریں کے درخت کے نیچے ایک بوڑھا کسان اور ایک ننھی سی لڑکی بیٹھی تھی —— کسان ہنس کر مرغ کی بولی بول رہا تھا۔ "ککڑوں کوں —— ککڑوں کوں ——"

ننھی لڑکی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "اباجی ایک دفعہ پھر۔"

"ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔"

مسافر کو تربوز کھاتے دیکھ کر وہ مچل اٹھی۔ "اباجی میں بھی تربوز کھاؤں گی۔"

میں بھی تربوز کھاؤں گی۔"

مسافر مڑا اور سریں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔

"سلام اھداہی" بوڑھے کسان نے کہا۔

"سلام بابا"

"میں تربوز کھاؤں گی اباجی۔"

مسافر نے تربوز کا ایک قتلہ لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکی کے گلاب سے رخسار شہابی ہو گئے۔ اس نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ وہ بڑے مزے سے اس کی گود میں بیٹھ کر تربوز کھانے لگی

کتنی پیاری لڑکی ہے۔ یہ تمہاری لڑکی ہے نا کیا نام ہے اس کا۔؟"

"جری (یعنی ننھی) جی یہ میرے بیٹے کی لڑکی ہے۔ لیکن مجھے ابا کہہ کر پکارتی ہے کیونکہ میرا بیٹا لام پہ گیا ہوا ہے۔ یہ اس وقت تین چار مہینے کی تھی۔"

لام۔ جنگ، یہ خوبصورت گول چہرہ، گلابی رخسار، چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں، مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ، پھٹتے ہوئے بم اور تاروں پر الجھی ہوئی آنتیں۔ اس نے سوچا بعض پیاسیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں بجھانے کے لئے انسان انسانوں کے قتلے کر ڈالتے ہیں

اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لئے چلا آ رہا تھا اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی کی نگاہیں نیچی تھیں اور قدم ناہموار، جب وہ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو سارے کسان راہی ان کے تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بنیا بھی اپنی دوکان سے باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر ان کے لئے دو چارپائیاں دوکان سے نکال لایا پھر ان پر اجلی چادریں بچھا کر انھیں بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔ ان کی شان بے نیازی اور ان کا انداز تفاخر کہے دیتا تھا کہ یہ نئے لوگ کسی ایسی پر اسرار قوت کے مالک ہیں جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں۔ ایک آدمی جو ان سب کا سردار معلوم ہوتا تھا اس نے لڑکی کو پرے ایک درخت کے نیچے بیٹھنے کو کہا اور پھر ان دو آدمیوں سے مخاطب ہوا جو اس نوجوان کسان کو پکڑے ہوئے تھے۔

"او دتے! شاہباز! اس حرامی کی ہتھکڑی ذرا ڈھیلی کر دو۔ اور اسے پانی وغیرہ پلاؤ۔

بنیا بولا! حضور جل لاؤں۔ ٹھنڈا میٹھا شربت۔ کوہاٹ سے نئی مصری منگوائی ہے۔

دلا اور شاہباز کسان کو ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے چشمہ کی طرف لیجا رہے تھے۔

جہاں پہلے ہی ایک خچر والا اپنے خچر کو پانی پلا رہا تھا۔

حضور نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں شاہ جی شربت پلایئے۔ بہت پیاس لگی ہے اور کھانا بھی ہم یہیں کھائیں گے۔ کوئی مرغی وغیرہ ہے؟"

"جی حضور، ابھی سب انتظام ہوا جاتا ہے۔" بنئے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے!

بتیسی نکالتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

خچروں والا خچر کو پانی پلا کر اس پر سامان لادنے لگا۔ دلا اور شاہباز نوجوان کسان کو پانی پلا کر واپس لے آئے اور اسے اپنے سردار کے سامنے بٹھا دیا۔

حضور نے کسان سے کہا "کان پکڑ و"

"میں کہتا ہوں حرامزادے کان پکڑو"۔

کسان نے اپنی بائیں ٹانگوں کے نیچے سے گزار کر کان پکڑے۔ دتے نے پتھر کی ایک بھاری سی سل اس کی پیٹھ پہ رکھدی۔ کان پکڑنے والے جانور کے منہ سے ہائے نکلی لڑکی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ حضور شربت پی رہے تھے۔ ایک دو گھونٹ پی کر کہنے لگے "شاہباز اس کی پیٹھ پہ ایک اور سل رکھ دو۔"

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اور اس نے اپنا منہ سرخ سوسی کے ڈوپٹہ میں چھپا لیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسان کی پشت دہری ہو کر ٹوٹ جائے گی۔ حضور نے پوچھا۔ "بول اب بھی اقبال کرتا ہے کہ نہیں! تو اس نابالغ لڑکی کو اغوا کر کے لایا ہے یا نہیں۔"

"نہیں" کسان نے رک رک کر کہا۔ "یہ نابالغ نہیں۔ اپنے آپ سے آئی ہے"۔

"مجنوں کے سالے" ابھی برابر انکار کئے جاتا ہے۔ شاہباز اس کی کمر پہ ایک اور پتھر رکھ دو۔"

نچر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ راہیوں کے رنگ اڑ گئے تھے یہ سب لوگ کسی پراسرار قوت کے زیر اثر معلوم ہوتے تھے۔ لڑکی نے چیخ کر کہا کہ ”اسے چھوڑ دو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں اسے چھوڑ دو، یہ مر جائیگا۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے ہی اسے ترغیب دی تھی اور نہ مجھے بھگا کر لایا ہے۔ در اصل میں اس کے ساتھ بھاگ کر آئی ہوں۔ یعنی میں ہی اسے بھگا کر لائی ہوں۔“

حضور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دیکھو دیکھو کیسی وکیلوں کی سی باتیں کرتی ہے تیری سب شوخی نکال دوں گا ذرا ٹھہر تو پہلے مجھے اس سے نپٹ لینے دے۔ کیوں بے الو کے پٹھے۔

الو کے پٹھے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں۔ میں نے کوئی اغوا نہیں کیا۔“

”اسے اسی طرح رہنے دو۔“ حضور نے فیصلہ سنایا۔ ”جب تک ہم کھانا وغیرہ کھائیں گے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے منہ پھیر لیا اور بنئے سے باتیں کرنے لگے۔ ”میں موضع دھیر کوٹ سے آرہا ہوں۔ یہ کسان اس خوبصورت لڑکی کو اغوا کر لایا ہے۔ چار دن سے مارا مارا اس کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ آج یہ دونوں عاشق و معشوق ہاتھ لگے۔ کرہاے سے پار جانے کی کوشش میں تھے۔ لیکن میں انہیں کب چھوڑنے والا تھا۔ میں اس ماتے کو سونگھ لیتا ہوں۔ جہاں سے مجرم ایک بار گذر جائے۔ اب یہ بدمعاش اقبال نہیں کرتا۔ ایک تو جرم کیا ہے۔ اس پہ یہ سینہ زوری۔

بنیا ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”حضور ہم تو حضور کے جان و مال کی دعائیں دیتے ہیں آپکی برکت سے علاقہ میں بالکل امن ہے۔ چوری چکاری ڈکیتی کا قریباً قریباً خاتمہ ہو گیا ہے یہ کسان لوگ بہت بیباک اور بے شرم ہوتے ہیں۔ اب اس کی طرف دیکھئے دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تاکنا کہاں کی شرافت ہے۔ اور پھر انہیں اغوا کر کے لیجانا۔ رام رام۔ حضور ایسے مجرموں کو تو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔

حضور نے اس نوجوان لڑکی کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ قانون یہی کہتا ہے شاہ جی، ہم تو قانون کے بندے ہیں، اگر کوئی اغوا کر لیگا یا کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالے گا، تو ہم خود اسے مجرم قرار دیں گے۔ اور اسے سزا دیں گے وہ مرغ آپ نے ابھی حلال کروایا کہ نہیں۔ شاباش جا شاہ جی سے مرغ لیکر حلال کر لا۔

نوجوان کسان کا چہرہ زمین سے لگتا جا رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا سب مسافر وہاں سے چل دئے تھے لیکن اس سے نہ جانے کیوں وہاں سے ہلا نہ جاتا تھا۔ اس نے سوچا یہ کوئی پراسرار طاقت تھی جس نے اس نوجوان کسان کو یوں الٹ اٹھانے پر مجبور کر دیا اور یہ بنیا اس کسان کی تکلیف پر اس قدر کیوں مسرور تھا۔ یہ نچر ہوں اس قدر گھبرائی ہوئی نگاہ سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یکایک دو گدھیں جھاڑی سے ایک ساتھ نکلیں اور خوشی سے چیخیں مارتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئیں۔ یہ گدھیں اس نے سوچا ایک دوسرے کو اغوا کر لیجاتی ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں۔ لیکن ان کی پشت پر کیوں کوئی پتھر نہیں رکھتا اور

یہاں کیوں ہر اس انسان کے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جاتی ہے جس کے سینے میں اپنے ہم نفس کے لئے محبت کی آگ روشن ہو اٹھے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔

شاہباز نے مرغ پکڑ لیا۔ مرغ چلّا رہا تھا۔ کڑو کڑ کڑ کڑ۔ کڑیں۔ کڑیں ـــ اور اسے وہ بوڑھا کسان یاد آگیا جو اپنی پوتی کو مرغ کی بولی سنا کر خوش کر رہا تھا اور جس کا بیٹا لام پر گیا ہوا تھا۔ نوجوان کسان کے صبر کا بند اب ٹوٹنے کو تھا۔ اس کا گلا رندھ گیا اور وہ کراہ رہا تھا۔ میرے اللہ۔ میرے اللہ۔

میرے اللہ! لیکن کائنات کی غیبی قوت خاموش تھی۔ کسان کی یہ معصوم امید کہ یہ غیبی قوت اسے بچائے گی۔ پگڈنڈی کی آرزو کے خام کی سی تھی۔ کیونکہ درحقیقت آسمان کہیں نہیں ہے۔ اس کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ جو چیز نہ ہو اس سے کیونکر کسی کو مدد پہنچ سکتی ہے۔

لڑکی ایک بار جوش میں آکر اٹھی اور اس نے پتھر کی سلیں اپنے ہاتھوں سے پرے دے ماریں۔ کسان سینے میں ترتراتا اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی اس کے گلے سے چمٹ گئی اور رو کر کہنے لگی "اقبال کرو، خدا کے لئے اقبال کرو۔ میں مر جاؤں گی۔ تم بھی مر جاؤ گے"۔

پھر وہ حضور سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "آپ اسے کچھ نہ کہئے میں اقبال کرتی ہوں کہ یہ زبردستی اغوا کر کے لایا ہے۔ زبردستی میں اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کے پاس واپس جانے کو تیار ہوں۔ آپ اسے اب کچھ نہ کہئے۔ میں ہر کسی آدمی کے سامنے یہ بیان دینے کو تیار ہوں خدا کے لئے اسے چھوڑ دیجئے

سہ پہر گذر رہی تھی، پہاڑوں کے سائے نچلی وادیوں کو اپنی تاریکیوں کی لپیٹ میں لے رہے تھے، اب وہ بہت مضمحل تھا۔ تھکن سے ٹخنوں، تلووں اور گھٹنوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اس کی ٹانگیں لکڑی کی ٹانگیں ہوں۔ اور ہر ایک جوڑ الگ الگ ہو۔ بہت دیر تک راستہ پر وہ اکیلا چلتا رہا۔ اس کے خیالات یاس انگیز اور اس کا تخیل جنونی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انسان ابھی انسان نہیں ہے۔ یہ جنگ جو آزادی اور تہذیب اور انصاف کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ غالباً آخری جنگ نہ ہوگی۔ آخری جنگ شاید اس ظالم جذبے کے خلاف ہوگی جو انسانی محبت کے سرچشمے پر سل رکھ کر زندگی کے اس منبع کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دینا چاہتا ہے لیکن یہ جنگ کب لڑی جائے گی؟ کب کب؟ شاید تب تک وہ زندہ نہیں رہے گا۔ غالباً زندہ نہ ہوگا۔ اپنی زندگی میں وہ انتقام کے اس بے پناہ جذبے سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکے گا۔ جس کی تشنگی سے اس کی روح کا ذرہ ذرہ کانپ رہا تھا۔ غصے اور رنج سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور اس کے قدم بھاری ہو گئے۔ راستے میں اسے مزدوروں کے کئی قافلے ملے جو نمک کے ڈلے اٹھائے اپنے گھروں کو لیجا رہے تھے۔ پہاڑی دیہاتوں میں نمک اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ یہ لوگ بنئے سے خرید کر استعمال کرنے کی توفیق نہیں رکھتے ـــ توفیق؟ ..... توفیق؟ آخر وہ کس چیز کی توفیق رکھتے ہیں؟ یہ تو محبت کی بھی توفیق نہیں رکھتے۔ اس نے سوچا اسے ایسی تلخ باتیں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ نوجوان ہے خوشحال ہے اور غیر شادی، مڈل اسکول کا

ہیڈ ماسٹر، زندگی کی ساری مسرتیں اسے مہیا ہیں۔ کل صبح اسے اپنی نوکری پر حاضر ہو جانا ہے۔ لڑکوں کو پڑھانا ہے۔ سچ بولو۔ ماں باپ کی عزت کرو۔ حاکم کا حکم مانو۔ بڑے ہو کر اغوا نہ کرو، یہ بنئے کی دوکان ہے۔ مرغ بولتا ہے ککڑوں کوں۔۔۔۔۔"

ایک خچر والا اپنا خچر لئے جا رہا تھا۔ خچر پر نمدہ پلان کسا ہوا تھا۔ لیکن اسباب نہیں لدا تھا۔ غالباً کسی جگہ سامان پہنچا کر واپس لوٹ رہا تھا۔ اس نے خچر والے سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟"

"کھرن کے درّے تک۔"

"کیا درہ موضع دھلیر کے راستہ پر ہے؟"

"ہاں اس سے پانچ میل ورے۔"

"مجھے اس خچر پر چڑھا کر لے چلو، کیا لو گے؟"

"جو جی میں آئے دے دینا۔ میں تو خچر واپس لے جا رہا ہوں۔"

"آٹھ آنے"

خچر والے نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ کود کر خچر پر سوار ہو گیا۔ خچر نے بدن کسمسایا، کان ہلائے، نتھنے پھٹپھٹائے، اور دیکھا کہ اب کوئی چارہ نہیں تو چل پڑا۔ خچر والا دلدوز آواز میں گانے لگا ع

کسی کی کھاٹ میں ملتی جوانی دیکھتے جانا

"کھرن کے درّے پر خچر والے سے رخصت ہوا اور اس سے راستہ پوچھ کر آگے بڑھا۔ چلتے چلتے وہ راستہ بھول گیا۔ یا شاید اس نے سمجھا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے اور کسی عجیب دنیا میں آنکلا ہے۔ یہاں پگڈنڈی ایک ٹیلے پر منتج ہو جاتی تھی۔ اس جگہ جنگلی گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے اور دو نوجوان لڑکیاں کاندھوں پر سوٹیاں رکھے ایک سبز پوش چٹان پر بیٹھی ہوئی لاجو گا رہی تھیں۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا۔
بھلا کیہڑے کے لایا دے لاجوا

لاجو آیا۔ لاجو آیا
چن مہاڑا چڑھیا بھلا بٹیاں دے اوہلے

اسے دیکھ کر پہلے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر شرما گئیں اور انھوں نے گانا بند کر دیا۔ مسافر ایک لمبا سانس لیکر ان کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔" اور گاؤ مجھے لاجو بہت پسند ہے"۔ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

"چن مہاڑا چڑھیا بھلا بٹیاں دے اوہلے دے لاجو!"

"کیکر ملساں بھیا جندریاں دے اوہلے وے لاجوا"۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا

لڑکیوں نے حیران ہو کر کہا "تمھیں 'لاجو' آتا ہے؟"

"ہاں۔ بلکہ میرا تو نام ہی لاجو ہے"، اس نے ہنس کر جھوٹ موٹ کہا۔ "اور تمھارا نام کیا ہے؟"

ایک نے کہا "بانو"۔

دوسری بولی "بیری"۔

اس نے کہا "اب تو لاجو گاؤ"۔

بانو اور بیری چند لمحے تک ایک دوسری سے سرگوشی کرتی رہیں۔ ان کے انداز کہے دیتے تھے کہ وہ کسی شرارت پر آمادہ ہیں۔ پھر انھوں نے شوخ سروں میں گانا شروع کیا اور وہ اپنے ہاتھوں سے تال دینے لگا۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا

بھلا کیہڑے کے لایا دے لاجوا

لاجو آیا۔ لاجو آیا
بھلا جوڑے گندھن لایا دے لاجوا

گاتے گاتے وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اور مسافر بھی ان کی اس سادہ ظرافت سے بہت محظوظ ہوا اور انہی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ کہنے لگا "یہ اگر لاجو کو بانو اور بیری کے جوتے گانٹھنے کے لئے کہا جائے تو اسے کبھی انکار نہ ہوگا"۔ اس تعریفی جملے کے بعد اس نے بانو اور بیری کے رخساروں پر وہ جنگلی گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے جو اس کے قریب بیلوں میں آویزاں تھے۔

وہ کچھ عرصے تک ان کے گیت سنتا رہا۔ اور ان کے گیتوں میں شریک ہوتا رہا پھر جب سورج غربی سلسلہ ہائے کوہ پر جھک گیا تو اس نے چلنے کی ٹھانی۔

بانو نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ "اچھا آج یہیں رہ جاؤ۔" "ہم تمھیں اپنے گھر میں جگہ دیں گے۔ تمھیں سونے کے لئے ایک کھاٹ چاہیے اور ایک کمبل ٹھیک ہے نا!"

بانو کی آواز میں ایک ہلکی لرزش تھی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر لال ہو گیا۔

بیری نے شوخ نگاہوں سے مسافر کی طرف دیکھا۔

اور مسافر نے ان پہاڑی مہ جبینوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا نہیں یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ میں ان الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ گو مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ بچپن سے ہی کھیلتا اور محبت کرتا چلا آیا ہوں۔ میں شاید تمھارے بچپن کا ساتھی ہوں، تمھارے لاپروا اور لاابالی بھائی کا دوست۔ تمھارے گیتوں کا لاجو میں نے ندی کے نیلے پانی کے تمھارے ساتھ تیرتے ہوئے تمھارے سنہرے بالوں کی چوٹی کو پکڑ کر

یوں گھسیٹتا ہے کہ تم بے اختیار چلا اٹھتی ہو۔ تمھارے ہاتھوں میں میں اپنا ہاتھ دیئے کئی بار بٹنگ کے گرد ناچا ہوں اور آلوک توڑ کر کھائے ہیں۔ تزناری کے پھولوں کا ہار بنا کر ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کئے ہیں۔ کئی بار جب چاند اخروٹوں کے جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا ہے۔ میں نے چاندنی اور اندھیارے کی کانپتی ہوئی شطرنج پر تمھارا انتظار کیا ہے۔ تمھاری لچکتی ہوئی کمر میں ہات ڈال کر تمھارے کسمساتے ہوئے بدن کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ میں ان پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح خوشنما اور نازک لبوں کا مزہ جانتا ہوں۔ تمھارے مدھم سانس کی حلاوت اور سیاہ آنکھوں میں چمکتے ہوئے موتیوں کی تابانی سے آگاہ ہوں۔ لیکن میں ان الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا میں اپنے دل میں اس سمے کو محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ جو شیشے کی چار دیواری سے باہر پھول کی طرح خوبصورت پروانوں کی طرح تکتی ہے اور جلتی اور جگمگاتی رہ جاتی ہے۔ مسافر نے نگاہ پھیر کر نیچے گاؤں کی طرف دیکھا۔ گھاٹی کے نیم دائرے کے نیچے گاؤں ایک خاموش ندی کے کنارے سویا پڑا تھا۔

کھیتوں میں مکئی کے پودے چپ چاپ کھڑے تھے۔ کناروں پر پیلی پیلی گھاس کسان کے ہات اور درانتی کے نغمے کی منتظر معلوم ہوتی تھی۔ کچے گھروں کی چھتوں پر اودے رنگ کی بجری ڈھلتے ہوئے دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ان چھتوں کے کناروں پر کہیں کہیں پیلی، سبز اور سرخ الیں رکھی تھی یا گول گول سرخ مرچیں مسافر نے پھر نگاہ پھیر کر بانو اور بیری کی طرف دیکھا اور پوچھا "موضع دھلیر یہاں

سے کتنی دور ہے؟"

بانو نے اداس لہجے میں کہا: "کوئی تین چار میل۔"

بیری بولی "دن ڈھلتا جا رہا ہے۔"

مسافر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "خدا حافظ ابھی بہت وقت ہے۔ اگلے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

مسافر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ یہ پگڈنڈی گھاٹیوں سے گذرتی ہوئی چیڑھ اور کائر کے جنگلوں میں چھپتی ہوئی کبھی کبھی اوپر آگے جا رہی تھی۔ پہاڑ کے آخری موڑ پر یہ نیلے آسمان کے ساتھ مل جاتی تھی۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ پگڈنڈی کی خواہش ایک سعی ناتمام نہ تھی، اسے معلوم ہوا کہ یہ پگڈنڈی پہاڑ کے کونے پر مڑ نہیں جاتی بلکہ سیدھی نیلے آسمان میں سے گذرتی ہوئی آگے جا رہی ہے۔ مسافر کا دل کسی نامعلوم مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اسی راستے سے گذرتا ہوا نیلے آسمان کی پگڈنڈی پر چلتا جائے۔ حسن کی کسی نئی دنیا میں   اسے خیال آیا کہ پہاڑ کا وہ کونا جہاں یہ پگڈنڈی بظاہر ختم ہو جاتی ہے ایک لامتناہی نیلی جھیل کا کنارہ ہے اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے اسے ضرور عبور کرے گا۔ وہ اس میں سے تیرتا ہوا اور نیلے پانی کو اچھالتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائیگا۔ یا شاید یہ نیلا آسمان ہی ہو۔ تب بھی وہ اس خوبصورت آسمان کی نیلاہٹ میں ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بن کر اڑ جائیگا اور چاروں طرف پھیلتا جائیگا۔ اور اس کے دل کی خوشی بڑھتی جائیگی

حتیٰ کہ وہ اس نیلے آسمان میں روح میں گھل جائے گا۔ اور مسافر کو اس عجیب احساس کی خوشی میں ایسا معلوم ہوا کہ اس کا سارا جسم لطیف ہلکا اور غیر مرئی بن گیا ہے اور وہ تیزی سے پگڈنڈی پر چلا نہیں لگتا تھا بھاگنے لگا۔

پھر یکایک وہ ٹھٹھک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔

سورج چوٹی پر غروب ہو رہا تھا۔ جنگلی گلاب کے بیلوں کا سہارا لئے دو سونے کی مورتیں اس کی طرف تک رہی تھیں۔ جھٹپٹے کے عالم کی خاموشی میں اس کے قریب سے گذرتی ہوئی ہوا اداس معلوم ہوئی تھی، اداس اور میٹھی جیسے اس نے جنگلی پھولوں کی ڈنڈیوں کا سارا شہد باہر کھینچ لیا ہو۔ ساری فضا میں جنگلی گلاب کی خوشبو، اور شفق کی رنگینی گھلتی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کچھ عرصہ ایک جگہ کھڑا ان کی طرف تکتا رہا۔ پھر اس نے بازو گھما کر انھیں سلام کیا۔ اور راستے پر مڑ گیا۔

لیکن اب اس کے دل کی غیر معمولی خوشی میں ایک عجیب اداسی بھی آ گئی اور اس کے قدم بھاری ہو گئے اور وہ چلتے چلتے خوشی اور غمی کی ان دونوں حدوں کے درمیان کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ نہ ہی تو عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں اور نہ ہی گلاب کے پھول، بلکہ وقت کے ایسے ہی چند ایک لمحے جو زندگی کی اندھیری رات میں روشن تاروں کی طرح جھلملاتے رہتے ہیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو

سنہ ۱۹۲۰ء کے مبہم بہار میں میں نے اپنی عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھا۔ ان دنوں ہم لوگ انگمور کی وادی میں رہتے تھے۔ جس کا شمار اب بھی کشمیر کی حسین ترین وادیوں میں ہوتا ہے، لیکن مجھے ان دنوں اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی، اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، ہم یہاں نئے نئے آئے تھے۔ میں اور میرا بڑا بھائی رام ماں جی اور پتاجی اور کامنی موسی جن کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ تھی، پھر یہاں اسکول میں لڑکے مجھے ایک امیر آدمی کا بیٹا جان کر قابلِ نفرت سمجھتے تھے، اور موقع پا کر پیٹ دبا کرتے اس کے علاوہ میں اسکول میں غالباً سب سے کند ذہن تھا، اس لئے بھی دونوں استاد مدرس اوّل اور مدرس دوم مجھ سے ناخوش تھے، کوئی مونس و غمخوار نہ تھا جو سات برس کے لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ ماں جی پتاجی کی دلداری میں مصروف رہتیں کامنی موسی ہر وقت میرا گلا ٹٹولتی رہتیں، آج پھر تو نے کھٹے آلوچے کھائے ہیں۔ ٹھہر تو سہی اور پھر وہ میرا گلا دبوچ کر مجھے اپنی رانوں پر لٹا کر میرا منہ کھول کر اس میں جوشاندہ ٹپکاتیں، جو اس گھاٹی میں اُگے ہوئے بنفشے سبز چائے تمباکو کی جڑوں اور نہ جانے کس بلا بتر سے تیار کیا گیا تھا، اوہ! کس قدر

تلخ، کھٹا اور بد ذائقہ ہوتا تھا وہ جوشاندہ   اور جب کامنی موسی میری ناک پکڑ کر مجھے زمین پر گرا دیتیں یا اپنی گود میں ڈھکیل دیتیں اور میں غلو غلو کرتے ہوئے جوشاندہ کو حلق سے نیچے نہ اتارنے کی کوشش کرتا، اور اسی ناکام کوشش میں موسی کامنی کے انگوٹھے کے چبا جانے میں کامیاب ہو جاتا تو جوشاندہ پینے کے باوجود پیٹا جاتا اس دنیا میں کوئی انصاف کہاں ہے، کوئی ایک غریب سات برس کے بچے کی نہیں سنتا انہی باتوں سے چڑ کر ایک دن میں نے سوچا کہ میں اب اسکول نہ جاؤں گا بلا سے جو ہوگا دیکھا جائیگا، آخر ایسا بھی کیا۔ ہمارا بھی اس دنیا میں رہنے کا اور اپنی سی کر گذرنے کا حق ہے۔ چنانچہ میں نے جلدی سے یہ سوچ کر سلیٹ، کاپی اور کتاب کو جزدان میں بند کیا اور تختی بغل میں داب کر اسکول کی راہ لی، تھوڑی دور چل کر جب گھر ٹینگیوں کے جھنڈ میں اوجھل ہو گیا تو میں نے اسکول کا راستہ چھوڑ دوسری پگڈنڈی پر چلنا شروع کیا جو گھاٹی سے اتر کر ندی کے کنارے کنارے دھان کے کھیتوں تک جاتی تھیں جہاں پن چکیاں تھیں، چشمے تھے، سبزہ تھا۔ جہاں دن بھر چرواہے اور چرواہیاں ریوڑ چراتے تھے

اسکول سے اور گھر سے بھاگنے کا یہ پہلا موقع تھا، اس لئے کچھ خوش خوش کچھ سہما سہما، کچھ آزاد سا کچھ اداس سا چلا جا رہا تھا اپنی ذہن میں اور سوچ رہا تھا کہ اس بستے کو کہاں رکھوں، اسے لئے پھرنا تو بڑی حماقت ہوگی، کوئی دیکھ لیگا تو پکڑ کر سیدھا اسکول لے جائیگا یا گھر، اب کیا ہو، اس بستے کو کہاں چھپاؤں،

جب گھاٹی کے زیریں حصے کی طرف پہنچ گیا تو میں نے اپنے بستے کو اور تختی کو داخ کے ایک بڑے جھاڑ میں چپکے سے رکھ دیا۔ یہاں لانبی لانبی گھاس اگی ہوئی تھی اور زمین پر جنگلی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں ان پر نیلے نیلے اور ہلکے قرمزی رنگ کے پھول آئے تھے جو چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان گراموفون کی اس بھونپو کی طرح نظر آتے تھے کہ جس کے سامنے سفید رنگ کا ایک کتا بیٹھا ہوتا ہے   یکایک مجھے ایک خوبصورت گلہری نظر آئی اور میں اسے پکڑنے کی کوشش میں داخ کی بیل پر جو شہتوت کے پیڑ پر بل کھاتی چلی گئی تھی اوپر چڑھتا چلا گیا، پھر گلہری مجھے چکمہ دیکر کہیں ان چوڑے چوڑے پتوں میں گم ہو گئی اور میں داخ کے ان خوشوں کو ٹٹولنے لگا، جن کے دانے ابھی زمرد کی طرح سبز تھے، اور اتنے ہی سخت، داخ کے ایک دو دانے میں نے توڑ کر کھائے، بڑے بکبکے اور کڑوے تھے، اور بیج جو زبان پر آ کر ٹوٹ گیا تو کونین کی گولی کی طرح تلخ معلوم ہوا۔ تلخ اور گلے کو گھونٹتا ہوا، میں ناامید ہو کر بیل سے نیچے اتر آیا۔ قمیض ایک ٹہنی کے قریب پھٹ گئی تھی اور پاجامہ بھی گھٹنوں کی رگڑ سے دو بڑے بڑے بھورے داغ لئے تھا، خیر، نیچے اتر آیا، جمائی لی، اُف کس قدر اداس ہے یہ دنیا، ان دنوں میں شاعر نہ تھا، افسانہ نویس نہ تھا، پڑھا لکھا نہ تھا ان دنوں نہ شفق میں خوبصورتی تھی، نہ ہوا میں لطافت نہ گھاس میں سوندھی سی خوشبو پھول۔ پھول تھے توڑنے کے لئے، گلہریاں پکڑنے کے لئے، تیتریاں پیچھے بھاگنے کے لئے، عورتیں جوشاندہ پلانے اور ناک مروڑنے کے لئے، اور

اور انگوٹھا چبانے کے لئے، مرد چٹیانے کے لئے اور کان پکڑ کر اسکول لیجانے کے
لئے مامور کئے گئے تھے۔ اس لئے میں نے زور سے اک جماہی لی اور سوچا کہ اب
کیا کروں، کہاں جاؤں۔ اب نہ گھر جا سکتا ہوں اور نہ اسکول میں نے سوچا کیوں
نہ میں ان پہاڑوں سے کہیں دور چلا جاؤں، جہاں اچھے لوگ بستے ہیں جہاں شہزادے
اور شہزادیاں بستی ہیں، جہاں جادوگر محل بناتے ہیں اور پری زادے ہنس کے پر والی
پریلی جھیلیں پار کرتے ہیں، ہاں بس یہ ٹھیک ہے!

یہ سوچ کر میں دانخ کے جھنڈ سے نکلا، اور گھاٹی کی ڈھلوان کی طرف بڑھا
گراموفون کے بھونپوؤں کو اپنے پاؤں سے کچلتا گیا، جوتا اتار کر میں نے اپنے بستے
کے قریب رکھ دیا۔ کیونکہ اب نرم نرم گھاس پر ننگے پاؤں چلنے میں لطف حاصل ہو
رہا تھا۔ میں نے زور زور سے سیٹی بجانا شروع کی، کامنی موسی مجھے اس وقت
سیٹی بجاتے دیکھ پاتیں تو کیا کہتیں   میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن
کامنی موسی کہیں نظر نہ آئیں   اوہ مجھے کیا پرواہ ہے   میں نے
اطمینان سے پھر سیٹی بجانا شروع کی۔ یکایک قریب سے کسی نے مجھے زور سے ڈانٹا
اور میں خوف سے اچھل کر بھاگا۔ پھر مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کامنی موسی نہ تھیں
ایک شریر ماہی مار تھا جو اب ہوا میں چیختا ہوا شوخی سے پر کھولتے ہوا۔ پر بند کر کے
ہوا میں ڈبکیاں لیتا ہوا۔ اڑا چلا جا رہا تھا۔ کمبخت نے مجھے یوں ہی ڈرا دیا تھا۔
میں نے زمین سے کنکر اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا، لیکن ایک کنکر بھی اسے نہ لگا۔

وہ قہقہے لگاتا ہوا مزے سے اڑتا ہوا ندی کی طرف چلا گیا، جانے دو بچو جی کو جب
ہم جادوگر سے جادو کی چھڑی چھین کر لائیں گے، پھر اس شیطان ماہی مار سے پوچھیں
گے کہ اس طرح چلتے چلتے لوگوں کے سروں پہ کھڑے ہو کر چیخنے کا کیا مطلب ہے؟

ڈھلوان کے آخر میں، گھاٹی کے دامن میں دو چشمے بہہ رہے تھے، یہاں گاؤں
کی لڑکیوں کا اکثر جمگھٹا رہتا تھا۔ میں نے سوچا یہاں کسی نے مجھے گھومتے ہوئے
دیکھ لیا تو رپورٹ ہو جائیگی۔ اس لئے میں نیچے کی طرف جاتا جاتا رک گیا اور پھر
رخ بدل کر گھاٹی کے درمیان سنبلو کی جھاڑیوں اور رکاؤ کے درختوں میں اپنے آپ کو
چھپاتا ہوا چلنے لگا۔ نیچے میں ان دو چشموں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ جہاں سے
لڑکیاں گھڑے بھر بھر کر لئے جا رہی تھیں، لیکن میرا راستہ ان کے راستے سے الگ
تھا، اور دونوں راستے گویا ایک دوسرے کے متوازی چل رہے تھے، جی
میں آیا کہ دو چار پتھر اٹھا کر دے ماروں اور گھڑے پھوڑ دوں تڑاخ سے گھڑے
پھوٹ جائیں گے اور جھک سے سارا پانی لڑکیوں کے کپڑوں کو شرابور کرتا ہوا نیچا
گر جائے گا۔ پھر سوچا اگر کسی نے مجھے پکڑ لیا تو   اور مجھے ابھی دور
بہت دور پریوں کے دیس جانا ہے کہ جس کی کہانی مجھے اکثر رات کو کامنی موسی
سنایا کرتی ہیں، اور جو ان کے کہنے کے مطابق سلسلہ ہائے کوہ کے پرے
واقع ہے، میں سوچ کر رک گیا۔ جھاڑیوں میں دو گلاڑیں خوشی سے چیخیں
اور پھر سے اڑ گئیں، ایک اور گلہری نظر آئی جو کاؤ کے ایک پتلے سے ٹھنڈ

ے لگی مجھے مقابلہ کی دعوت دے رہی تھی، لیکن اب تو میرے پاجامے کے پائنچے
بھی اوس سے گیلے اور کانٹوں سے تار تار ہو چکے تھے۔ اس لئے میں نے آگے بڑھ
جانا ہی مناسب سمجھا، آگے بڑھا تو دیکھا کہ بالکل سامنے ایک خوبصورت چکور، موٹا
موٹا چکبرا چکور مزے سے ٹہلتا ہوا جا رہا ہے۔ عین سامنے بالکل راستے میں
میں اسے دیکھ کر رک گیا اور ایک تنے کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اسے
کس طرح پکڑا جائے۔ پھر سارے داؤں سوچ کر میں آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ
گھٹنوں کے بل چلنے لگا تاکہ آہٹ نہ ہو۔ ہر لمحہ مجھے اس کے قریب لا رہا تھا، یکایک
چکور نے گردن موڑ کر مجھے دیکھ لیا اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے
اپنے پروں کو ایک ہلکی سی جنبش دی۔ اور میں نے ناامید ہو کر سوچا کہ اب یہ اڑا
لیکن میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب وہ مجھے دیکھ کر بھی بدستور اپنی چال سے
چلتا رہا۔ میں نے سوچا ضرور یہ چکور جانور کسی کا پالتو ہے، اور چھوٹ گیا ہے
یا پھر یہ ابھی بچہ ہے جو اڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ زخمی ہو کسی لڑکے نے
گوپھیا مار کر اس کا پر توڑ دیا ہو۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ادھر
چکور نے بھی پھر میں نے گھٹنوں کے بل پر چلنا چھوڑ دیا۔ اور
سیدھا اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ اور عین اسی وقت کہ میں اسے دبوچنے کو
تھا، چکور نے اپنے پر پھیلائے اور اطمینان سے اڑتا ہوا ایں چکر لگانے لگا
اور میں گھبراہٹ میں ایک گھماڑے کے درخت سے ٹکرا گیا اور نیلا دھاری کی

جھاڑی میں جا گرا، اور وہاں سے لڑھک کر سبزے پر جو پھیلا ہوں تو بیر کے
ایک بڑے جھاڑ کے نیچے جا کر ہی رکا۔

یہاں پر ایک لڑکا چاقو کی مدد سے زمین کھود رہا تھا، میری ہیئت کذائی دیکھ
کر اٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی کمر پہ دونوں ہاتھ ٹیک کر قہقہے لگانے لگا۔ میں جلدی سے
کپڑے جھاڑ کر اٹھا اور گو میرے پاؤں اور بازو کانٹوں سے زخمی ہو گئے تھے میں
اس پر بھی اپنی مٹھیاں بھینچ کر اس کی طرف بڑھا اور اس سے پوچھا "کیوں ہنستے ہو
جی؟"

ہو ہو ہو!!! اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ تم اسکول سے
بھاگے ہو؟"

"ہاں" میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا۔ "کیا تمہارے باپ کا
اسکول ہے؟"

ہو ہو ہو۔!!! وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ میرے
باپ کا اسکول ہوتا تو تم وہاں سے بھاگ سکتے؟ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے
ہیں۔ اور آج تک ہمارا ایک گھوڑا بھی نہیں بھاگا

"میں گھوڑا نہیں ہوں"۔ میں نے غصے سے کہا۔

ہو! ہو! ہو!! وہ چیخا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اک دم مجھے بازو
سے پکڑ لیا۔ اور اپنے قریب کھینچ کر بولا۔ " جانتے ہو، میں چاقو سے زمین

کیوں کھود رہا ہوں ؟"

"کوئی خزانہ ہوگا۔" میں نے ایسی لاتعلقی کے انداز میں کہا، جس میں ذرا سی
دلچسپی بھی پائی جاتی تھی۔ اس سے خفا ہونے کے باوجود میں اس گم شدہ خزانے میں
دلچسپی لینے سے اپنے آپ کو کیسے روک سکتا تھا

"خزانہ نہیں ہے!" اس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"تو پھر جادو کی تختی ہوگی۔" میں نے جواب دیا

نہیں۔ جادو کی تختی نہیں ہے۔"

تو پھر کیا ہے یہاں"

خونی بوٹی"۔

خونی بوٹی"۔

ہاں خونی بوٹی"۔ کبھی پیاز کھایا ہے تم نے؟ بس خونی بوٹی کی شکل بھی
بالکل پیاز کے مانند ہوتی ہے۔ لیکن اس میں خون بھرا ہوتا ہے

خون؟ کس کا خون ہے۔ کسی جن کا خون ہے اس میں

"نہیں، کسی جن وِن بھوت کا خون نہیں۔ اس میں آدمی کا خون ہے"
اس نے جواب دیا اور میرے سارے بدن میں جھرجھری آگئی۔

"آدمی کے خون کو کیا کرتے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا

پیتے ہیں!

"پیتے ہیں؟" میں نے خوف زدہ ہو کر اس سے پوچھا

ہاں بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اور میرا باپ کہتا ہے، جو لڑکا اس خونی
بوٹی کا خون پی لے، وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے، اونچا اڑن کھٹولے
کی ضرورت نہیں رہتی

ارے واہ میں نے خوشی سے تالی بجائی اور اس کا چاقو
لے کر کہا۔ "لاؤ مجھے یہ زمین کھودنے دو۔"

"تم پرے ہٹ جاؤ۔" اس نے مجھے غصے سے ڈھکیل کر کہا۔ "یہ بوٹی
میری ہے۔ اس کا خون میں پیوں گا۔"

نہیں۔ میں پیوں گا میں نے کہا اور نہیں تو میں تمھیں
یہ جگہ نہیں کھودنے دوں گا۔"

وہ بولا۔ اچھا۔ تو ہم باری باری زمین کھودیں گے، جب جڑی نکل
آئے گی تو اس کا آدھا خون تم پی لینا، آدھا میں پی لوں گا۔ اور پھر ہم دونوں
ہوا میں اڑ جائیں گے۔ میں نے خوشی سے کہا "اور ماسٹر کے سر پہ پیشاب کریں گے
اور دور، بہت دور پریوں کے دیس میں چلیں گے۔ کامنی موسی کہتی تھیں۔

وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولا۔ "تو تم بنگلے میں رہتے ہو۔ اس کے
لہجے میں حقارت تھی

میں نے شرمسار ہو کر کہا۔ "ہاں" اور پھر تم کہاں

رہتے ہو؟"

وہ بولا ۔ میں اس اونچے پہاڑ پہ رہتا ہوں ۔ ہمارا گھر مٹی کا ہے ۔ دو منزلہ ہے ۔ تمہارا بنگلہ تو صرف ایک منزل کا ہے ۔ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں میرا نام امجد ہے

خونی بوٹی کی خاطر میں اس سے لڑائی مول نہیں چاہتا تھا ۔ اس لیے میں نے اس شیخی خورے کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ ہو رہا ۔ امجد اور میں باری باری چاقو سے زمین کھودتے رہے ، گھونگھے ، چھوٹی چھوٹی سیپیاں ، سپید زرد اور سبز رنگ کے پتھر نکال کر ان سے اپنی جیب بھرتے رہے آخر میں ایک لمبی جڑ کے نیچے وہ پیاز کی گٹھلی سی نظر آئی اور میں نے چیخ کر کہا ۔ " خونی بوٹی "۔

" ہٹو ۔ مجھے دیکھنے دو ۔ کہاں ہے ؟ امجد چلایا ۔ اور اس نے پھر مجھے پرے دھکیل دیا ۔ " ادھر لاؤ چاقو ، تم کہیں اسے زخمی کر دو گے اور سارا لہو گٹھلی سے نکل کر مٹی میں گھل جائے گا ۔ پرے ہٹو اب وہ نہایت احتیاط سے اس گٹھلی کے اردگرد کی زمین کو کھود رہا تھا

آخر وہ بھورے رنگ کی گٹھلی جس کے چاروں طرف مٹی لگی ہوئی تھی ، صحیح و سلامت باہر نکال لی گئی ۔ اب وہ امجد کی انگلیوں میں لٹک رہی تھی ۔ اڑن کھٹولے کی طرح امجد آہستہ آہستہ اس کی جلد پہ سے مٹی اتارنے لگا ۔ میں نے امجد سے کہا ۔ " اسے اچھی طرح تھامے رہو ورنہ یہ اڑ جائے گی

تمھیں کیسے معلوم ہے ؟ اس نے مجھ سے پوچھا

میں جانتا ہوں ۔ میں نے کہا

امجد جب گٹھلی صاف کر چکا تو بولا ۔ " اب اس کا آدھا حصّہ کیسے ہو گا ۔

" میں بتاؤں ۔ اس کے بیچ میں چاقو سے ایک سوراخ ، اور پھر اس سوراخ کو انگوٹھے سے دبا دو ۔ اور قطرہ قطرہ کر کے منہ میں ٹپکاتے جاؤ ۔ میرے منہ میں اور اپنے منہ میں ۔ باری باری ۔ لو اب جلدی کرو ۔ مجھے اڑ کر پریوں کے دیس جانا ہے ! " میں نے کہا

امجد نے چاقو سے گٹھلی میں شگاف کیا ۔ اور وہاں انگوٹھا رکھ دیا ۔ پھر اپنا منہ کھول کر اس نے انگوٹھے کے دباؤ کو ذرا سا ڈھیلا کر دیا ۔ اور آدمی کا خون اپنے منہ میں ٹپکانے لگا ۔

وہ پہلا قطرہ میں اس سرخ خونی قطرے کو دیکھنے کے لئے اس قدر بیتاب تھا ۔ کہ میرا منہ بھی بے اختیار کھل گیا ۔ جیسے وہ قطرہ میرے منہ میں ہی ٹپکنے کو تھا ۔

لیکن وہ قطرہ نہ ٹپکا ۔

امجد نے انگوٹھے کو شگاف سے ذرا پرے سرکا دیا

اور پرے سرکایا

اور پرے سرکایا ۔

بالکل ہٹا دیا۔

ارے!

گٹھلی سے خون کا قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

پھر جلدی سے گٹھلی کو چیر گیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ لیکن خون کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ بس پیاز کی مانند تہ بہ تہ چھلکے تھے۔ اس میں اور کچھ نہ تھا۔ ذرا سا لے کر چکھا۔ کڑوا زہر تھا۔

امجد نے اسے لیکر ذرا نیچے پھینک دیا   اور پھر بولا یہ گٹھلی کچی ہے۔ ابھی اس میں خون پیدا ہی نہیں ہوا

امجد اور میں ندی کے کنارے بہت دیر تک تیرتے رہے، اور جب تیرتے تیرتے تھک جاتے تو پانی سے نکل کر ریت پر لیٹ جاتے، اور سورج کی گرم گرم کرنوں اور ریت کی تپتی ہوئی سطح سے اپنے جسم کو گرماتے اور کسی چوڑے پتھر پہ کانوں کو ٹیک کر ان میں سے پانی نکالنے کی کوشش کرتے۔ یہاں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے، چھوٹے چھوٹے چرواہے اور چرواہیاں جوان بڑی بڑی بھینسوں، گایوں، گھوڑوں اور گدھوں کے گلوں کی اس چابک دستی سے نگہداشت کرتے تھے کہ مجھے تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ دیو ہیکل جانور جو قریب ہی سبزے پر چر رہے تھے ان ننھے چرواہوں کے رعب میں آ کر ان کے ہر اشارہ

کو حکم سمجھ کر بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرتے تھے۔

میں اور امجد ریت پہ لیٹے تھے، اور امجد کے قریب پارو لیٹی تھی، اور پارو کے قریب دو تین اور لڑکے اور لڑکیاں   اور پارو کے بھورے بھورے بال سورج کی کرنوں میں گہرے سنہری ہو گئے تھے، اور پارو مجھے بڑی اچھی لگی تھی

اور ندی میں تیرتے وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تیرتے رہے تھے اور ایک دوسرے پہ پانی اچھالتے رہے تھے، تیرتے تیرتے ہم دونوں پتھر کے ان سلوں پہ اچک کر بیٹھ جاتے جو ندی کے بڑے بہاؤ کو ہمارے تیرنے کی جگہ سے الگ کرتی تھیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے پارو سے کہا
"میں ندی کے بڑے بہاؤ میں بھی تیر سکتا ہوں"۔

"جھوٹ!" وہ بولی۔

"میں ہوا میں بھی اڑ سکتا ہوں۔" میں نے کہا

"اڑ کر دکھاؤ" وہ بولی

میں نے کہا "میں پریوں کے دیس جا رہا ہوں۔ آج مجھے کانی موسی نے بتایا ہے کہ۔"

پارو اپنا نچلا ہونٹ ایک عجیب ادا سے سکیڑ کر بولی۔
"تو تم بنگلے میں رہتے ہو نا"۔

ہاں! اور میرے بنگلے میں پیلے گلاب کی ایک بہت بڑی بیل ہے۔ تم نے

پہلے گلاب دیکھے ہیں۔

"نہیں!" پارو بولی

"اچھا تو میں تمہیں بہت سے پیلے گلاب دوں گا۔ اور ایک ہار بناؤں گا، تمہارے لئے۔"

پارو اپنی پریشان لٹوں سے پانی نچوڑتے ہوئے بولی۔ "اچھا تم ہم تم سے بیاہ کریں گے امجد سے نہیں کریں گے۔"

امجد؟ میں نے کہا۔ "امجد تو بدھو ہے۔ وہ تو اسکول بھی نہیں جاتا......"

اتنے میں امجد تیرتا ہوا ہمارے قریب آیا اور اس نے ہم دونوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیا۔ ہم پھر تیرنے لگے۔ اور پانی کی کتیاں ایک دوسرے پر پھیرنے لگے۔ ہتھیلیوں میں پانی بھر کو اسے اس طرح چھڑکتے کہ پانی اک بلند دائرہ کی صورت میں فضا میں بکھر جاتا۔ کبھی ہم دھب دھب ٹانگیں ہلا کر نقلی آبشار گراتے اور پانی کی سطح کو بلوئی ہوئی جھاگ میں تبدیل کر دیتے۔

اب ہم سب ریت پر لیٹے دھوپ کا لطف لے رہے تھے پارو اور میں بالکل قریب لیٹے ہوتے لیکن کمبخت امجد بیچ میں آ کر پارو کے قریب اوندھا پڑ گیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی ریت میں گھسی ہوئی تھی۔ کالے کھردرے بالوں میں کیچڑ اور ریت تھی اور کان کے لووں کے قریب ریت میں پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے، وہ نیم باز نگاہوں سے کبھی مجھے کبھی پارو کو دیکھ لیتا۔

میں نے کہا۔ "پارو اور میں بیاہ کر رہے ہیں"

پارو کھلکھلا کر ہنسی۔

امجد نے غصے سے پارو کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف۔

میں نے کہا۔ "اور پارو میرے ساتھ پریوں کے دیس جا رہی ہے۔"

امجد کی نگاہوں میں گویا خونی بوٹی کا لہو اچھلنے لگا۔ اس نے قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنی انگلیاں ریت میں گاڑ دیں اور اپنی مٹھیوں میں ریت بھینچ کر بولا۔ "یہ سچ ہے پارو؟"

پارو نے اپنی سنہری لٹ جو اس کے رخسار پر لرزاں تھی اپنے دانتوں کے درمیاں رکھ لی اور چپ چاپ ہنسنے لگی۔

امجد نے اپنی ریت سے بھری ہوئی مٹھیاں اوپر اٹھائیں اور وہ اسی ریت کو میری آنکھوں میں جھونکنے کو تھا کہ ندی کنارے کسی نے آواز دی۔ "ہو جریہ روٹی کھا لینو!"

یکایک بھوک سب پر غالب آ گئی۔ امجد کی مٹھیاں ریت سے خالی ہو گئیں اور ہم سب لوگ ندی کے کنارے توت کے درخت کے نیچے چلے آئے۔ مکئی کی روٹی تھی اور گنبھار کا ساگ، ہر گھر سے گنبھار کا سالن آیا تھا۔ دو ایک گھروں سے یہ سالن بھی نہ آیا تھا، صرف مکئی کی روٹی تھی اور پسی ہوئی سرخ مرچ اور نمک، پارو کے گھر سے پیاز کی تین گٹھلیاں بھی آئی تھیں۔ اور پارو نے انھیں جلدی سے پتھر کی

ایک بڑی سی سل پر رکھ کر میں ڈالا اور نمک مرچ اور وہیں سے جنگلی پودینہ توڑ کر چٹنی بنا ڈالی سب سے پہلے اس نے گھی کی روٹی پہ چٹنی رکھ کر مجھے کھانے کو دی۔ پھر امجد کو بعد میں خود امجد اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ مجھے روٹی کھانے میں بڑا مزا آیا۔ پارو کے کنواری چہرے پر اس وقت ایک عجیب معصوم شریر، شوخ اور بھولی سی مسکراہٹ تھی۔

وہ چہرہ، وہ مسکراہٹ، مجھے اب بھی یاد ہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ ندی سے پانی پی رہے تھے کہ امجد نے مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ پارو چیخی، میں نے غصہ میں آکر امجد پہ پانی پھینکا اور پھر ندی سے نکل کر اس سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔

امجد بولا۔ "بس اپنے بنگلے کو چلے جاؤ سیدھے۔ پارو سے میں بیاہ کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں پارو سے میں بیاہ کروں گا۔ تو تو مسلمان ہے۔ پارو سے بیاہ کیسے کرے گا؟"

وہ بولا۔ "اس میں کیا ہے۔ تم تو باہر کے رہنے والے ہو۔ تم پنجابی ہو۔ ہم کشمیری ہیں۔ اور پھر تمہارا باپ بنگلے میں رہتا ہے۔"

بنگلے کا ذکر سن کر سارے چرواہے ہنسنے لگے

"اور پھر تو اسکول جاتا ہے ہر روز — اسکول!"

پھر امجد دوسرے چرواہے اور چرواہیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

دیکھا تم نے — یہ لڑکا روز اسکول جاتا ہے!"

اسکول پر پھر ایک بلند قہقہہ گونجا اور میں نے تاؤ میں آکر امجد کو ایک گھونسہ لگا دیا۔ امجد نے مجھے ..... جلد ہی ہم ایک دوسرے پر پل پڑے۔ گتھم گتھا ہو گئے اور لڑکے لڑکیوں نے ہمیں ایک حلقے میں لے لیا۔ اور شور مچا مچا کر داد دینے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا دم پھولنے لگا۔ اور امجد نے مجھے زور سے زمین پر پٹخ دیا اڑی گھوڑا دے کر۔ اور میری چھاتی پہ چڑھ بیٹھا۔ اب میں بازی ہار چکا تھا اور ریت میری آنکھوں میں تھی، اور کانوں میں اور حلق میں، پھر بھی جب تک میں نے اچھی طرح دانت گڑا کر اس کے بازو کو نہ کاٹ کھایا! امجد نے مجھے چھوڑا نہیں۔

ایک لڑکے نے کہا۔ یہ غلط بات ہے۔ اس نے امجد کی بازو کو کاٹ کھایا ہے

دوسرا بولا۔ "ہاں یہ کشتی کے داؤ میں داخل نہیں۔"

تیسرا بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

ایک لڑکی بولی۔ "اسے سزا ملنی چاہئے۔ یہ ٹھیک نہیں لڑا۔"

پارو بولی۔ "ہاں اس لڑکے کے کپڑے یہاں رکھ لو۔ اس نے امجد کی بازو کاٹ کھائی ہے۔ یہ لڑکا ہے یا باؤلا کتا۔"

پھر سب چرواہے باؤلا کتا، باؤلا کتا کہہ کے مجھے چڑانے لگے، میری آنکھیں جو پہلے ہی ریت سے جل رہی تھیں، اب غم و غصے سے بھر آئیں اور میں دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا ننگ دھڑنگ اپنے بنگلے کو روانہ ہوا اور دور تک چرواہے

اور چرواہیاں ناچ ناچ کر اور چیخ چیخ کر مجھ پر آوازے کستے رہے "بنگلے کا باؤلا کتا، بنگلے کا باؤلا کتا!"

کپڑے کھوئے۔ جوتا کھویا۔ جزدان کھویا۔ اور ہر جگہ اچھی ٹھکائی ہوئی۔ ندی پر۔۔۔ گھر پہ ۔۔۔ اسکول پر ۔۔۔ لیکن مجھے کسی پر غصہ نہ تھا۔ نہ امجد پر ۔۔۔ نہ گھر والوں پر ۔۔۔ نہ مدرس پر ۔۔۔ مجھے صرف پارو پر غصہ آتا تھا اور رہ رہ کر آتا تھا ۔۔۔ کم ذات کمینی ۔۔۔ کہتی تھی اس کے کپڑے چھین لو ۔۔۔ ہائے ہائے نہ ہوئی اس وقت میرے پاس جادوگر کی چھڑی۔ ورنہ کمبخت کو ایک پل میں چھیا بنا دیتا ۔۔۔!"

پارو میرے جذبۂ محبت کی پہلی شکست تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں اس وجہ سے، اس شکست، اس رنج، ان آنسوؤں کو نہ پہچان سکا تھا۔ لیکن ... شکستوں کے اس لمبے جلوس پر جب کبھی میں مڑ کر نظر دوڑاتا ہوں تو حدِ نگاہ پر مجھے پارو کا کندنی چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کی بھولی بھولی آنکھوں میں معصوم شرارت ہے اور اپنی دانتوں میں اس نے ایک سنہری لٹ داب رکھی ہے اور خاموشی سے ہنس رہی ہے ۔۔۔!

دوسرے دن شاید کوئی تیوہار تھا اور میں نئے کپڑے پہنے بنگلے کے باہر زرد گلاب کی بیل کے نیچے کھڑا تھا اور اس امید میں تھا کہ کب ماں کیمرہ لے کر باہر آئیں اور میرا فوٹو اتارے، اتنے میں امجد ہاتھ میں گوپیا لئے دوڑتا ہوا وہاں سے گزرا۔

مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کہنے لگا۔ "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" میں نے منہ پھیر لیا۔

اس نے گلاب کے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگا رنگ تیتریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "آہاہا۔ تمہارے ہاں تو بڑی اچھی تیتریاں ہیں۔ تم انہیں پکڑتے نہیں..." اس کے لہجے میں بڑی ملائمت تھی۔ جیسے وہ مجھ سے معافی طلب کر رہا ہو۔ میرا دل بھی تھوڑا سا پسیجا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔ اس نے اپنے گوپیے میں ایک کنکر رکھ کر زور سے چلایا۔ اور بولا "دیکھو ۔۔۔ یہ کنکر وہاں پارو کے گھر تک چلا گیا ہے۔ آج پارو نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔"

میں چپ ہو رہا۔

"ہم شہر میں بیاہ کرنے جا رہے ہیں" وہ بولا

میں جواب دینے کو تھا کہ سامنے سے مجھے پارو آتی ہوئی دکھائی دی، وہ اجلے کپڑے پہنے اپنے باپ کی انگلی سے لگی چلی آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کے سر پہ ایک نہایت خوبصورت سبز رنگ کے ستاروں والی مخملی ٹوپی تھی۔ اور پاؤں میں چرچر کرتا ہوا نیا جوتا تھا۔

یہ اس کے چاچا کا لڑکا ہے۔ امجد نے خود ہی مجھے بتایا۔

پارو نے ہم دونوں کو پہلے گلاب کی بیل کے نیچے کھڑے دیکھا۔ اس نے ہم دونوں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا ۔۔۔ اور پھر ایک مغرور ادا سے منہ پھیر لیا۔

اور اپنے چچازاد بھائی سے ہنس ہنس کر بات کرنے لگی۔ پھر وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے پارو کے باپ کے آگے ناچتے ہوئے دوڑنے لگے پارو کا باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

امجد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے نہایت احتیاط سے گوپھیے میں ایک کنکر رکھا اور اسے ایک زناٹے کے ساتھ پارو اور اس کے ساتھی لڑکے کی طرف پھینکا۔ پارو نے مڑ کر ہماری طرف شریر نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکرا کر اس نے بالوں کی ایک لٹ اپنے دانتوں میں داب لی اور پھر ناچتی دوڑتی آگے چلی گئی ......!

امجد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "بڑی کمینی ہے پارو!"

"کم ذات ہے!" میں نے کہا۔

اور اس کا باپ تو دیکھو۔ وہ بولا گنجا، سڑے چھڑے کی طرح...

میں نے کہا۔ "اس کی ناک دیکھی؟ کریلے کی طرح! ......

امجد بولا۔ "اور اس لڑکے کا منہ کیسا تھا؟ جیسے پھٹا ہوا ڈھول!

اور وہ چلتا کس طرح تھا۔

میں نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "وہ بگڑ بٹے کی طرح!

ارے وہ تیتری۔ آہاہا۔ امجد چلایا۔

اور پھر ہم دونوں باڑھ پھاند کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس یاقوتی تیتری کی طرف لپکے جو باغیچے میں ناچتی ہوئی جا رہی تھی۔

ویکسی نیٹر

جب میں ایف، اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں ویکسی نیٹر بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا۔ ریشماں تھی، ریشماں کے حسن و جمال کا چرچا تو میں اس سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا اور خاص کر راستے میں ایک پولیس سارجنٹ نے جب اسے معلوم ہوا کہ میں پنڈورہ کے گاؤں میں ویکسی نیٹر بن کر جا رہا ہوں مجھے بتایا کہ پنڈورہ کی دلکش وادی میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ گلشن جی کا کنڈ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہ لگا سکا۔ جاگیر دار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہیں اور جو آج کل ویران پڑا ہے اور صرف اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب جاگیر دار صاحب یا ان کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈورہ کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں، کھٹے اناروں کا جنگل، جو پنڈورہ کے مغربی پہاڑیوں پہ پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگل ٹنگ، سیب آلوچے۔ بہی اور آلوک کے درخت بھی پائے

جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلیں کسی محبوب کی باہوں کی طرح ان پھل دار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں۔ اور جن کی آغوش میں ننھے ننھے پھول ہر لحظہ مسکراتے اور شرماتے ہیں۔ ہاں پنڈورہ کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن اگر تم نے وہاں ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈورہ میں کچھ نہیں دیکھا۔

"سچ سچ" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خدا کی قسم ——————!" پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پہ سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی؟ ان پولیس والوں کی باتوں پہ اعتبار کم ہی کرنا چاہئے اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے، چاہے وہ حبشن ہی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرغ کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتا ہے لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا ویکسی نیٹر بن کر یہاں آیا تھا تو میری شکل و شباہت بہت سے لوگوں کے لئے قابلِ رشک تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دنوں گاؤں بھر میں۔ میں ہی اپنے ڈھنگ کا ایک چھیلا جوان تھا اور پھر انٹر پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا، گیارہ روپے تنخواہ تھی، کلاہ پر طرّے دار لنگی، پاؤں میں کامدار جوتی، اور چہرے پہ مونچھیں سائیکل کے

اینڈل کی طرح تڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا مرے بانکپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ، دوست، وہ بھی کیا دن تھے، کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا، دیوانِ غالب میں مجھے ایک شعر بہت پسند ہے۔ وہ ہے ... ... آہ اس وقت کمبخت یاد نہیں آ رہا۔ دماغ چکرا ... زبان پہ آ رہا ہے، لیکن ——

اچھا۔

ہاں تو میں رشیماں کے متعلق کہہ رہا تھا۔ لیکن میں رشیماں کے متعلق کیا کہوں، رشیماں کی آنکھیں ان نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں ان دو پاک و صاف جھیلوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں، جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں، رشیماں کے نازک لب، شرمسار، محجوب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیمان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کے پورے۔ جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوشیزۂ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آ گئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور ابلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچ دار۔ اس کا قد فارسی کا ایک شعر ہے، ایک نہایت ہی موزوں شعر ہے۔ لیکن ...... کمبخت یاد نہیں آ رہا، بالکل زبان پر پھر رہا، آہ، کیا خوب شعر تھا، نظیری کا شعر، نہیں عرفی!

آہ، اب حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا —— کچھ یاد نہیں رہتا، مجھے اب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا۔

تو یہ تھی رشیماں پشاور کی وادی کی حسینہ۔ بیشک ایک نایاب چیز تھی اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس کے باپ کو ہر روز رشیماں کے واسطے کے لئے پیغام آیا کرتے، کوئی پانچسو روپے۔ کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی منچلا تین ہزار روپئے تک دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا باپ صرف شاید نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا۔ کم از کم میں نے تو اسے کسی سے ہامی بھرتے نہیں دیکھا نہ سنا، خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا، شاید وہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا، اور یوں بھی تو رشیماں کسی بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا جوانی بری بلا ہے، اور جوانی کی محبت اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، میں نے رشیماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دنیا میں رشیماں صرف میرے لئے ہے، اور میں اس کے لئے اور یہ ٹھان لی۔ کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے، لیکن اگر شادی ہوگی تو صرف رشیماں سے، نہیں تو جان پہ کھیل جاؤں گا۔ اس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دوں گا، سارے گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ اس کے سامنے پہاڑی پہ سے نیچے نالے میں کود کر مر جاؤں گا۔ لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہوگا کہ میرے جیتے جی میری

ریشماں کہ کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیر دار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو بیاہ کرے جائے جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے۔ بیوقوفوں کی سی باتیں۔ فضول، خطرناک، عاقبت نااندیشیاں۔

تو صاحب میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی، لوگوں کو ٹیکہ دیکھ لگانا کیسا، ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا، پاگل کتے کی طرح، وہ چشمے پہ پانی بھرنے جاتی، تو مجھے پہلے ہی موجود پاتی، چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی، تو میں بھی اپنی توڑے دار بندوق لئے ہوئے جنگل میں آموجود ہوتا۔ میں ان دنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا، میرا مطلب ہے کہ میں ماہیا بہت مزے میں گایا کرتا تھا اور اکثر لوگ میرے ماہیا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوئی مراثی بھی اتنا اچھا ماہیا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وہ دن کہاں، اب تو دن میں مجھے دس بار کھانسی کی شکایت ہوتی ہے، تم شہر میں رہتے ہو کبھی کوئی اچھی سی دوا ہی بھیج دیا کرو۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے بسنے کا ہمیں کیا فائدہ، کیوں؟ ....

خیر..... ایک دن کی بات ہے۔ میں کسی قریب کے موضع سے چیچک کے ٹیکے لگا کر واپس آرہا تھا، شام ہو چکی تھی اور مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت مغموم تھا، کیونکہ دن بھر میں گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے ریشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا چنانچہ بہت ہی حزیں لہجے میں آہستہ آہستہ ؏

"فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے"

گاتا ہوا چلا آرہا تھا، میں اس وقت بہت اداس تھا، میری آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، اور مجھے اپنے آپ پر بہت خیال آرہا تھا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں ایک خوبانی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس خوبانی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے اپنی سنہری کاکلوں کو اپنی نازک شانوں پہ پریشان کئے ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے چند صدیوں کی طرح گزر گئے۔ پھر ریشماں بولی۔ اپنی نرم میٹھی آواز میں۔ "جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟" میں نے کہا "اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، اور تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ریشماں بولی۔ "جی مجھے سب سہیلیاں طعنے دیتی ہیں" اور پھر اس طرح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں، میں آپ کو گالیاں دوں گی، تو پھر آپ ...."

میں نے کہا۔ "تو میں نے کب منع کیا ہے، آپ شوق سے گالیاں دیں۔ میں انہیں سنتا جاؤں گا۔ اور پھر انہیں اکٹھا کر لوں گا۔ پھولوں کی طرح پھر ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔

ریشماں بولی۔ "ہم ٹھہریں ان پڑھ۔ بھلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بنانا کہاں سے آئیں، لیکن میں آپ سے کہتی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں

ابا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں، کہتے تھے اگر وہ لوکا باز نہ آیا تو اسے قتل کروا دینگے

میں نے سر جھکا کر کہا۔" یہ سر حاضر ہے۔ ابھی گردن اُڑا دیجئے۔ اگر اُف کر جاؤں تو ــــــ"

ریشماں نے ایک عجیب ادا سے سر ہلا کر کہا۔" ہائے یہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر ــــــ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

میں کچھ نہیں چاہتا،" میں نے اپنا ہاتھ اپنے کلیجے پر رکھ کر کہا" ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمہارے پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگاؤں، اور تمہارا نام لیتا ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں

ریشماں مسکرائی۔ ایک لڑکی کی طرح نہیں، بلکہ ایک عورت کی طرح مسکرائی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھا۔ پھر وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوش نما اور نازک گالوں پر جھک گئیں۔ دوسرے لمحہ ہنستے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی جاتی تھی اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی۔

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا رہا۔ پھر میں نے بھی ریشماں کے پیچھے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا، وہ ایک ہرنی کی طرح تیز بھاگ رہی تھی، اس کے منہ سے ہنسی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

اب میں اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ لیکن ابھی اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی۔

لیکن میں اب اور بھی قریب آ گیا تھا۔ اور ہمارے درمیان بالکل تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔

" دیکھو، ہمیں ـــ ہمارا پیچھا مت کرو ــــــ میں کہتی ہوں یہ اچھا نہیں ــــــ

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اسے جا دبوچا اور آغوش میں اٹھا لیا۔" اب کدھر جاؤ گی؟"

" مجھے چھوڑ دو ــــــ مجھے چھوڑ دو ــــــ میں گھر جاؤں گی۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر رک گیا، اور اسے سبز روش پر آہستہ سے گرا دیا، اور پھر اس کے قریب ہی ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔

" دیکھا تم نے؟" تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں، میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی۔

ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے، شفق گم ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا، ہاں، پہاڑوں پر اب جنگل دکھائی نہ دیتے تھے۔ اندھیرے کی سیاہی میں غائب ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں تارے

بھی نکل آئے تھے۔

میں نے رشیاں سے پوچھا" تم مجھ سے کب نکاح کروگی ؟"

"کبھی نہیں"۔

"وہ کیوں"

"تم تیلی ہو، ہم مغل ہیں" رشیاں نے شوخی سے کہا

"اس سے کیا ہوتا ہے ؟" میں نے رشیاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں"۔

"ہرگز نہیں"۔

"تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو ؟"

جواب میں رشیاں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا پھر یکایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"میں آج خوب پٹوں گی۔ ابا مجھے ڈھونڈھ رہے ہوں گے۔ لیکن یہ کہہ کر آئی تھی کہ خالہ کے یہاں جا رہی ہوں، لیکن اب دیر بھی تو بہت......"

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔" تجھ ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پیٹا جائے"۔

رشیاں بولی" میں جانتی ہوں، تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے"۔

میں نے کہا" ہاں، کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغل زادی ہو"۔

رشیاں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا، پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"تم کتنے ناشکرے ہو" اس نے ایک آہ بھر کر کہا

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یکایک آسمان کے ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاندنی کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیر اثر ناچنے لگے ہیں اور مغربی ہوا کے جھونکے چنار کے پتوں میں چھپ چھپ کر غیر فانی زندگی کے گیت گا رہے ہیں۔ میں نے رشیاں کی لمبی لمبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابل برداشت ہوگی اور جب میں نے وفور شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے تب مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن، دونوں ہی احساس تھے، ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت

اس کے بعد آٹھ دس دنوں کے کوائف میں تمھیں اچھی طرح نہیں بتا سکتا، کچھ یاد نہیں آتا، زندگی ایک دل خوش کن خواب کی طرح گذر رہی تھی ؛ جس میں میں اور رشیاں ہی تھے۔ کچھ عجب سی حالت تھی، شراب کا سا نشہ، دلفریب نغموں کا سا سرور۔ سارا گاؤں جنت نظر آتا تھا اور دور سے جاگیر دار صاحب کے پرانے محل کے برج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے عجیب اور پراسرار، مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رعنائیاں، پرندوں کے چہچہے، بے فکر گڈریوں کے قہقہے

ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں، میرے اور رشیاں کے لئے۔ تاکہ شام کے جھٹپٹے میں ہم دونوں چھپ کر اور باہوں میں باہیں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں جا بیٹھیں اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں"۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پر زور جھٹکے کے ساتھ میرے دلفریب خواب کو منتشر کر دیا۔ عین اس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے بھاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ رشیاں کے ظالم باپ نے اسے جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے در پردہ مشورے ہو رہے تھے۔ جاگیردار صاحب کا لڑکا بہت اوباش ہے جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ رشیاں پر لٹو تھا۔ کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ بس رشیاں کے باپ پہ ڈورے ڈالنے شروع کر دیے ادھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت یہ پتہ چلا کہ جب رشیاں شہر میں جاگیردار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی۔

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا لوگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں دو سال تک پاگل سا رہا۔ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گیا تھا۔ در بدر گھومتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا " مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ وہ مجھے کاٹنے کو آ رہی ہے۔ بس یہی دو کلمات تھے جو ہر وقت میری زبان پر جاری رہتے۔ سنا ہے کہ ایک دن جب میں جاگیردار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا انھوں نے کہیں مجھے

کہیں دیکھ لیا اور جب کسی صاحب سے انھوں نے میری رام کہانی سنی تو مجھ پر ترس کیا اور علاج کے لئے شکار پور کے پاگل خانے میں بھیج دیا اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا بلکہ اس گاؤں میں نہیں بلکہ دور کے گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔

اتنا کہہ کر دیکھی نمبر چپ ہو گیا، اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ رشید نے آہستہ سے پوچھا۔

"اور رشیاں؟ .... تم نے اسے پھر کبھی دیکھا؟"

رشیاں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے۔ اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں لیکن رشیاں کو اپنے مالک کے چہیتی ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے.... اس کے دو لڑکے بھی ہیں....... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے اس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی، اس کا باپ، اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبردار ہے اور علاقہ کا ذیلدار۔ اس کا مکان پتھروں سے بنا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا۔ وہ جس پر ٹین کی چھت ہے اور جس کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے...... میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا، وہ خوبصورت ریشمی لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ وہ اب بھی بیحد خوبصورت تھی اس کی چال شاہزادیوں جیسی تھی۔ میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا

رشیاں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی ریشمی کپڑوں کے بجائے وہ سرخ سوسی کی بھاری شلوار اور چھینٹ کی قمیص پہن کر میرے اپنے بچوں کو لے کر یوں ٹہلا کرتی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور انھیں پونچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور اسے گالیاں دینے لگا۔ میں نے اسے سخت فحش کلمات کہے۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ اس کے سارے خاندان کو جی بھر کر اور چیخ چیخ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلا جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر اور گھسیٹ کر پرے نہ لے گئے۔

"اور رشیاں نے تمھیں کچھ نہ کہا؟" رشید نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گردن جھکالی اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے آنسوؤں کے چشمے بہہ نکلے، اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا........ بعد میں جب وہ اپنے گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ" اس کے سوال پر کہ تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں؟" رشیاں نے جواب دیا "اس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا یا جان سے مار ڈالتا تو بھی میں وہاں سے نہ ہٹتی........ پھر اس نے کہا اے میری جان سہیلی، وہ گالیاں نہ تھیں، پھول تھے، میرے محبوب کے جنھیں میں نے چن چن کر اپنے آنسوؤں کے تاروں میں پرو دیا اور اپنے دل کے

مزار پر چڑھا دیا، تاکہ محبت کی قبر سونی نہ رہے۔

لیکن دکیمی نیٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے ہوئے کہا

"مجھے اب کسی پر غصہ نہیں۔ کسی سے محبت نہیں۔ میں اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا پہلے چیچک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا۔ اب دو آنے لئے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں۔ اس گاؤں میں سوائے رشیاں کے باپ کے سب میرے قرض دار ہیں وہ مجھے کنجوس اور ظالم کہتے ہیں، لیکن انھوں نے کب میرا بھلا چاہا، ان کا بس چلے تو آج مجھے قتل کر دیں، لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں، میرے پاس روپیہ ہے، زمین ہے، بال بچے ہیں۔ تین نکاح کر چکا ہوں مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ کسی سے محبت نہیں۔ کسی پر غصہ نہیں، میں جاگیردار صاحب کی وفادار رعایا ہوں، ان کا غلام ہوں،

کیا سچ مچ تمھیں کسی پر غصہ نہیں آتا؟" رشید نے تیز نگاہوں سے دکیمی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

دکیمی نیٹر گھبرا سا گیا، آنکھیں نیچی کر کے بولا "نہیں، ہرگز نہیں، میرا دل صاف ہے، لیکن دوست........" اب دکیمی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھالیں۔ اور رشید کی طرف مجبوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

.... "میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اور اسے کہتے وقت میرا سینہ پھٹا جاتا ہے، اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا، اور وہ

بات جاگیردار صاحب کے اس پرانے برجوں کے متعلق ہے ...... میں انھیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بارہا پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میرا منہ چڑا رہے ہیں میں انھیں صاف صاف کہتے ہوئے سنتا ہوں، تم ہمیں نہیں جانتے، ہم اب بھی تمھاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں، تمھارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں۔ تمھاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔ تم ہمیں نہیں پہچانتے ...! ہا، ہا، ہا!

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج موجود ہیں، میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ بارہا میرے دل میں خیال کرتا ہے کہ ایک دو پیپہ کا بارود لیکر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں اور بارود لگا کر بھک سے ان برجوں کو اڑا دوں تو ...... تو ... لیکن میں نے ہر بار اس موذی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے۔"

اور دکیی نیٹر نے رازدارانہ لہجے میں رشید کی طرف جھک کر کہا "لیکن ایک دن میں اس کام کو ضرور پورا کر کے چھوڑوں گا۔"

جنت اور جہنم

زینی کے متعلق میں کیا جانتا ہوں یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مد و جزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف ناپائدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں، اور عموماً یہ مبہم سی تصاویر لہروں کے دوسرے ہی ریلے میں یوں فنا ہو جاتی ہیں کہ پھر کوئی ان کا نام و نشان بھی نہیں پا سکتا یا پھر نئے نقوش اپنے تزئین اور حسن امتزاج سے نئی جمالیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش میں اس ساحل کے ریت کا ہر ذرہ گنگنا اٹھتا ہے "کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی یا یہ نغمۂ حیات کی ایک اضطراری لے ہے؟"

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائدار اور مبہم نہیں ہوتے اور وہ ساحلِ حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں، ایسی ہی تصویروں میں سے ایک تصویر زینی کی بھی ہے اور در اصل ایک ہی نہیں، بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینی کا خیال آتا ہے تو بیک وقت اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں تین مختلف تصاویر، تین مختلف نگاہ کے تین مختلف زاویے کا خیال آتا ہے جس طرح سات رنگوں کے ملکوں سے قوس قزح بنتی ہے، اسی طرح ان تین تصاویر کی ترتیب

زینی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے۔ لیکن یہ زندگی قوسِ قزح سے بہت مختلف ہے۔
کہیں مختلف!"

دیکھنے میں تو زینی قوسِ قزح ہی کی طرح حسین تھی، میں نے جب پہلے پہل اسے
دیکھا تو اس وقت میں سات پلوں والے شہر کے سب سے خوبصورت پل امیرا کدل پر
جھکا ہوا جہلم کی سطح پر تیرتی ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا، یوں ہی بیکار سا، آوارہ
سا، اکتایا ہوا، سری نگر کی دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا۔
شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پردے ایک طرف کو ہٹے ہوئے
تھے اور ان میں کہیں موٹے موٹے مردوں کے ساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں۔
جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک
رہے تھے۔ کہیں تنومند وجیہ نوجوان کے ہمراہ بھدی اور بدشکل عورتیں اپنے
بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں جو عورت
جتنی زیادہ بدصورت تھی وہ اتنا ہی زیادہ اچھا اور بھڑکیلا لباس پہنے تھی
دراصل پردے کی رسم تو ان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی اور ان کے
شوہروں کے چہرے کم از کم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے بیچارے
دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان
کی تلافی کرنا چاہتے تھے، اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب میٹھی آواز
میں ہنس ہنس کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کم از کم

مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی، شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر
کوئل کا رنگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔

شکارے خوبصورت اور بدصورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے، لیکن
ان میں زندگی کی حرکت، بےچینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا، وہ پانی کی سطح پر چھاتے
جا رہے تھے۔ لال لال پردے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے، بھدی شکلیں حسین
تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، قہقہے اور ہانجیوں کے گیت ایک ہی نغمہ بن جاتے
اور وہ شکارے دربار حال کے سامنے اس کے سفید سفید ستونوں کے قریب
پہنچ کر شہر وینس کا سا نظارہ پیش کرتے ہوئے یک لخت موڑ پہ غائب ہو جاتے،

لیکن یہ حرکت، یہ زندگی، ان لمبے لمبے دو دو درجوں کے ڈونگوں یا ہوس بوٹوں
میں نہ تھی، جو پانی کی سطح پر چپ چاپ بطخوں کی طرح تیر رہے تھے۔ ان کی کھڑکیاں
بند تھیں، لیکن پردے آویزاں تھے، صرف ایک ہوس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی
تھی۔ کھڑکی کے دونوں طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی سویٹر بن رہی تھیں، کیا
یہ لوگ سری نگر میں سویٹر بننے کے لئے آتے ہیں، یا میری طرح پل کے جنگلے کے
قریب ہو کر محض تماشا دیکھنے کے لئے؟

اور پھر مجھے اس وقت زینی دکھائی دی۔ جہلم کے پانی کا ایک ہی ریلا
اسے میرے دل کے ساحل کے قریب کھینچ لایا، وہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کے
کنارے پر کھڑی کشتی کا رخ بدل رہی تھی، رخ بدلنے کا چپو اس کے ہاتھ میں تھا

اور چاندی کا ایک "جھمکا" اس کے کان میں کسی خاموش نغمے کی گت پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا، پھر جیسے وہ بجلی کی تیزی کی طرح پل کے نیچے سے گذر گئی اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سرا نظر آیا۔ یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لئے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے کو کھے رہا تھا۔ اس کا گول و سرخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی بھی پل کے نیچے غائب ہو گئی۔ اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پل کی دوسری جانب آ چکے تھے! وہ ڈونگے کو نچلے گھاٹ پر لگانے کے لئے رخ بدل رہے تھے ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پردے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے کنپٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا جو دھوپ میں چمکتے ہوئے نیلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آ رہا تھا۔ "THE HEAVAN" "جنت" یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہوگا، جنت اب نچلے گھاٹ کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا "TO LET" جنت کرائے کے لئے خالی تھی! میں جنگلے سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زینی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ معاً میرے دل میں ایک خیال آیا، اور میں ایک تیزی سے امیرا کدل کے پل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

زینی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے

ایک عجیب جھجک اور ایک عجیب بے باکی کے ساتھ کشتی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اور چھوٹے لڑکے سے بولی "عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ"۔

عزیزا ہنستا ہوا اٹھا، وہ یوں ہی ہنس رہا تھا، بغیر کسی وجہ کے، کشمیری لڑکوں کی طرح، اس کے دانت جو ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کے بغیر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے، اس کے سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر بے پروائی سے زینی کے قدموں میں پھینک دی، اور پھر زینی نے جس ملائمیت اور لطافت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے، اسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس کی آنکھیں عزیزا کی اس معصوم شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے۔ اور جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو زینی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔

عزیزا کہنے لگا۔ "یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ اس طرف آئینہ والا میز ہے، یہ لکھنے کا میز"۔

اور میں نے عزیزا سے پوچھا۔ "کیا یہ ہوس بوٹ تمہارا ہے؟ اور وہ لڑکی کون ہے؟"

"وہ؟" عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ زینی ہے، میری خالہ ہے، یہ ہوس بوٹ زینی کے خاوند کا ہے، وہ نوکری کی

تلاش میں سوپور گیا ہے۔ یہ، اس الماری میں چینی کے برتن، دو سیٹ اچھے
پڑے ہیں، یہ کھانے کے برتن، دو گیس لیمپ"

"اچھا، اچھا۔ آگے چلو"۔

"یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے، ان میں پانچ پلنگ
آسکتے ہیں، میں اور زینی اس کمرے میں رہتے ہیں؛ وہ چھوٹا سا کمرہ جو کچن
کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔

"اچھا، چلو کچن دکھاؤ"۔

سب کچھ دیکھ لیا۔ اس چھوٹے سے دوم درجے کے ڈونگے کو جسے زینی
اور عزیزا فخریہ لہجے میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینی اور عزیزا کے ہونیوالے
"صاحب" نے جسے پنجاب میں اس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی
وجہ سے "گڑو بگڑ یا چوزخ" کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینی کو بار بار
دیکھ کر بھی اس کے دل کی پیاس نہ بجھی۔

"زینی"! میں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اڑاتے ہوئے
پوچھا "اس ——— زینی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس ہوس
بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا؟"

زینی نے اپنی باریک آواز میں کہا "کیا صاحب یہیں رہے گا؟!"

"ہاں، ہاں، اسی بوٹ میں"۔

"تب یہ کمرہ آپ کے لئے خالی نہیں"

"ارے ———" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "وہ کیوں"۔

عزیزا ہنستے ہوئے بولا۔ "صاحب ہمیں ڈل جانا ہے، دراصل ہمیں سوپور جانا ہے
مگر راستے میں ڈل آئے گی۔ جھیل ڈل، اور مانس بل، ہم یہ ڈونگا لیکر سوپور جائیں گے
جہاں زینی کا گھر والا گیا ہے، پھر ہم اس کو لیکر واپس آئیں گے، اگر صاحب کو ڈل دیکھنا
ہے تو منظور، ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی تھوڑا ہوگا۔ اگر صاحب کو ادھر ہی
رہنا ہے تو پھر ہم مجبور ہیں"۔

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا، عزیزا کا ہنستا ہوا معصوم سا چہرہ بہت پر امید تھا
گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا "چلو صاحب، ڈل دیکھنے چلو صاحب" میں نے
زینی کی طرف دیکھا، زینی کا چہرہ آنچل کی اوٹ میں تھا، کیا وہ بھی اپنے خاوند سے
ملنے کے لئے بیقرار تھی، اور تو! ——— اے شاعر مزاج آوارہ سیاح! تو
اس خطرناک مثلث کو کیوں پیدا کرنا چاہتا ہے؟ ہوس کے غلام! کیا تیرے لئے
اس دنیا میں کوئی اور کام نہیں؟ کوئی آرزو، کوئی مطمح نظر نہیں؟

لیکن دل کے ساحل پر اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ہلکی اور لطیف
ہوتی ہیں، آئیں اور چلی گئیں، اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے ہوئے لاکھوں
ذروں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا عزیزا، آج شام کو تم اس ہوس بوٹ کو

امیرا کدل کے سامنے ______ اس گھاٹ پہ سے آنا۔ کل ہم ولر جھیل چلیں گے“

”وہ بہت اچھا صاحب“ عزیزا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

زینی کا چہرہ بدستور آنچل کی اوٹ میں تھا۔

ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) راستہ پر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا۔ حسن کیا ہے؟ اور انسان پھر حسن سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متأثر ہوتا ہے؟ حسین پھول جب مرجھا جاتا ہے تو لوگ اسے پاؤں تلے کیوں روند دیتے ہیں؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جننے کے بعد آپ کی تعریفی نگاہوں کی مستحق نہیں رہتی؟ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ ایک تنومند کسان دن بھر ایمانداری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے نان و نفقہ مہیا نہیں کر سکتا اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور اوباشیوں کا بارِ گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھوڑ کر اس دلفریب وادی میں جنت کے مزے لوٹنے کے لئے آجاتے ہیں اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتھیا لی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہیں چھین لیں گے؟ تقدیر؟ تناسخ؟ رضا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حماقتیں ہیں۔ ان کے بارے

میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے؟ کیا یہی کافی نہیں ہے کہ زینی حسین ہے اور اس کا خاوند سو پور گیا ہوا ہے اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر ولر دیکھنے جا رہے ہیں۔“

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رائے سے متفق نظر آتے تھے، گوہر بخش اپنی ڈاڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا، ”میں بھی چلوں گا۔“

بھیا لال بولا ”میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گذر ہی جائیں گے، اور آخر اب یہاں سری نگر میں رکھا ہی کیا ہے کیوں سرفراز؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

محمود بولا۔ ”کیوں بھئی، میں بھی چلوں؟“

اب رہ گئے۔ اندر اور نثل۔ وہ دونوں بندی کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کشمیر آ کر زندگی کی حماقتوں پر غور کرنا بجائے خود سب سے بڑی حماقت ہے۔ اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی ولر کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔

گوہر بخش نے کہا ”آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب لے چلو۔ ہارمونیم، طبلہ، گراموفون، کیمرہ، دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے، کیک، جیلی، اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے نجات کا سامان بھی لیتے چلو، اور ہاں بھئی سرفراز، تم وہاں سے اس کمبخت ڈونگے والے ہی کو بلا لاتے، اسی سے یہ سامان اٹھوا کر لیجانے کو کہتے ہیں۔“

تھے ، گو میں اپنا حق سب پر فائق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اچھی طرح واضح کر دی تھی لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چڑیا کسی کے جال میں پھنسنے والی نہیں ، اس کی ادائیں دلربا تھیں ، اس کے گیت دلکش ، اس کی مسکراہٹ دل افروز ، لیکن اسے اپنے خاوند سے محبت تھی ۔ اسے اپنے خاوند پر ناز تھا ، جو سوپور میں تلاش معاش میں مصروف تھا ، جب وہ چہچہاتے چہچہاتے یکایک ہنس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کے لئے نہ ہوتی ، عزیزا کے لئے بھی نہیں جو اسے اتنا پیارا تھا ، پھر کبھی چپو ہاتھ سے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی ۔ جدھر سوپور تھا ۔ اس وقت گور بخش ایک بے سرے لہجے میں چلا اٹھتا ۔ " دلدار کتندا دلاں وا ۔۔۔ دلدارا "

بھیا لال نے تو پہلے دن زینی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا " گو شکل و صورت سے تو میں روایتی مجنوں ہوں ، لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلیٰ مجھے محبت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی ، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کی کسی لیلیٰ پر بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی اس لئے اب میری پہاڑی لیلیٰ ! " گڈ بائی " لیکن بھیا لال ہی پر کیا منحصر ہے ، قریباً قریباً یہی حال ہر ایک کا تھا شروع شروع میں گور بخش نے زینی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گیت سنائے تھے ، اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھونتے بھونتے اسے مچھلیوں کی ایک پلیٹ بھی پیش کی تھی اور کبھی کبھی اندر اور مثل پھلوں کے ٹوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چرا کر اسے دیدیا کرتے

کوئی کمبخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے

" لڑکی ؟ " سب نے یکایک چیخ کر کہا ۔

برس پندرہ یا کر سولہ کا سن " ۔

لیکن انھوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا ۔ مصرعہ زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے ، " ابے گاؤدی " " ابے لگر بگڑ یا چرخ اس کا نام کیا ہے ؟ " " شکل کیسی ہے " " بچہ جی بتاتے ہو یا اپنا گلا دبواؤ گے ؟ "

ہمیں سری نگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے ۔ اور اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مانوس ہو چکے تھے ، دن رات کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا ، ہاں کبھی کبھی برج کھیلتے اور کبھی کیرم ۔ ڈونگا اپنی چال سے جہلم کی سطح پر بہا جا رہا تھا ۔ محمود اکثر دوربین لگائے ان دور کے اور بلند سلسلہ ہائے کوہ کی طرف دیکھتا رہتا ۔ جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں ۔ گور بخش ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلوں سے سریلی تانیں نکالتا اور بھیا لال اپنے دبلے پتلے اور لمبے قد کے ساتھ بار بار ڈونگے کی چھت کو ہاتھ لگا کر ہم کوتاہ قدروں کی تضحیک کر کے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ۔۔۔۔۔ اور زینی ؟ لیکن زینی کے تو ہم سب پرستار

کرتے تھے اور ہاں کبھی کبھی کیک کے ٹکڑے بھی ۔ لیکن اب چند دن سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی، اور اب سب لوگ زینی کو تقریباً بھول گئے تھے ۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا، گانا، ناچنا جہلم میں تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے، ہر ایک چہرہ بشاش نظر آتا تھا اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وزن پہلے سے دوگنا ہو گیا ہے"۔

بھیا لال نے اپنی توند کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ارے یار میں تو سچ مچ موٹا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون مجھے کمر کے گرد معلوم ہوتی ہے"۔

اندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے گال اب پہلے سے پچکے ہوئے نہیں رہے

رشل بولا "اب میں آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے چہرے پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔

محمود جو اشتراکی خیالات رکھتا تھا طنزیہ لہجہ میں بولا "ہاں، انقلاب قریب آ رہا ہے!"

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی، لیکن اس میں شک نہ تھا کہ سوپور ضرور قریب آ رہا تھا، کل وڈر اور پرسوں سوپور، اور پھر شاید یہ زینی کی شوخ ادائیں بھی عمر بھر میسر نہ آ سکیں گی، میں کچن کے دروازے پر کھڑا ہو کر زینی کی

کی طرف دیکھنے لگا، جو ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چپو سے کشتی کا رخ ٹھیک کر رہی تھی، ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزیزا پسینے میں تر بتر ڈانگا چلا رہا ہو گا"، دل میں سوچا، بیچارہ غریب گیارہ سال کا لڑکا، لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ کچن کے عقب میں جو کمرہ تھا وہاں محمود سویا پڑا تھا، اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی کبھی کبھی ڈرائنگ روم سے ہنسی کی ایک بلند چیخ سنائی دیتی، اندر نے برج کھیلتے وقت بلف سے کام لیا ہو گا ۔

زینی نے کہا، "صاحب کل ہم وڈر پہنچ جائیں گے ۔

"جھیل وڈر کیا بہت خوبصورت ہے ؟

زینی سر ہلاتے ہوئی بولی ۔ جی صاحب! جدھر نظر اٹھاؤ پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک چاروں طرف نیلا پانی، اور بیچ میں کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے ایک اور سری بٹ ناگ"

"سری بٹ ناگ کیا"۔

"بٹ ناگ وڈر کا دیوتا ہوتا ہے، وڈر کا بادشاہ ہے، وہاں ہر ایک سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، یا انگریز کچھ نذر دینی پڑتی ہے"۔

"اور اگر وہ نہ دے"

"تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے"

"اچھا تو کیا جھیل وُلر بہت خوبصورت ہو گی؟"

"صاحب خود دیکھ لیں گے"۔

"تم سے بھی زیادہ خوبصورت؟" میں نے زینی کے قریب جا کر کہا،

زینی کا چہرہ جو پہلے ایک سیب کے پھول کی طرح تھا، اب ایک گلاب کا پھول بن گیا۔ اس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپیہ کا ایک نوٹ نکالا، اور زینی کے ہاتھ میں دیدیا اور جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا "یہ لو اسے سری ٹیٹ ناگ کی نذر کر دینا"۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر یک لخت زینی چپو چھوڑ کر تن کر کھڑی ہو گئی اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے نوٹ کو زور سے اپنی مٹھی میں مسل ڈالا اور پھر اسے تیزی سے پانی میں پھینک دیا، زینی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نمدار ہو گئی تھیں اور بالوں کی ایک لٹ داہنے رخسار پہ اتر آئی تھی۔

یہ زینی کی دوسری تصویر ہے جو، آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے میں آج بھی آنکھیں بند کئے چشم تصور سے اسے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک کچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا، متعجب اور پشیمان، اپنی شکست کی زندہ تصویر، نوٹ چکر کاٹتا ہوا پانی کی سطح پر بہہ رہا تھا آخر اسے ایک مچھلی نے نگل لیا، آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصہ میں شفق کی لالہ گوں لہریں غائب ہو گئیں، اور رات کی سیاہ چادر پہ تاروں کی افشاں چن دی گئی ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کیوں، کیا تم زینی کو بھی ایک مچھلی سمجھتے تھے۔ وہ مچھلی جو تمھارے پانچ روپے کے نوٹ کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل جاتی، لیکن وہ پانی کی مچھلی نہیں، آدم کی اولاد ہے۔ اسے اپنے بھلے برے کی تمیز ہے، وہ غریب ہے تو کیا ہوا، وہ تمھارے روپوں کی محتاج نہیں، تم اسے نہیں خرید سکتے۔ کبھی نہیں خرید سکتے۔

دوسرے دن ہم وُلر کے کنارے پہنچ گئے اور ہم نے اپنے ڈونگے کو وہاں بندھوایا، جہاں دریائے وُلر جھیل جہلم میں داخل ہوتا ہے، حدِ نظر تک سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا اور دور بہت دور چاروں طرف ایک سلسلہ کوہ ایک نیلگوں دیوار کی طرح نظر آ رہا تھا، مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچوں کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے کس سی نظر آ رہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی ورنہ اگرچہ ہوا زور کی چل رہی ہوتی تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں

محفوظ رہ سکتی تھیں۔

لیکن اگرچہ ہم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے۔ ہوا بالکل ساکن رہی اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک، ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا، یہ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہوا گھوم رہا تھا؛ اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن ہم نے کشتی کے ملاحوں کے کہنے پر بھی ڈر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پیسہ تک نذر دینا گوارا نہ کیا۔ اور پھر ہم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھوٹا سا بھنور تھا اور پہلے بھنور سے قریباً چار میل کی دوری پر واقع تھا یہاں البتہ گوربخش نے جو تیرنا کم جانتا تھا ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں جو خدا جانے کتنے دنوں سے بھوکا تھا کیونکہ ملاحوں کے کہنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینہ پیشتر تین لڑکوں کو پیش آیا تھا جو اس جھیل میں کشتی چلاتے چلاتے ان طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھی

سہ پہر کے بعد جب ہم جھیل کی سیر سے لوٹے تو زینی اور عزیزا دونوں کو زار و قطار روتے ہوئے پایا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ زینی کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے، روزگار کی تلاش میں، ایک آدمی سوپور سے آیا تھا وہ ادھر سے گذر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا ہم نے زینی

اور عزیزا کو جہاں تک ہو سکا تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھمتے ہی میں نہ آتے تھے، وہ اپنے آپ کو اب بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے، اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی، یہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بیوقوف کشمیری کو اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا؟ پنجاب میں کیا اسے قارون کا خزانہ مل جائے گا؟ گدھے؟ بیوقوف غریب، ان میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی محض بوجھ اٹھانا جانتے ہیں، خچروں کی طرح، انھیں انسان سمجھنا ہی حماقت ہے۔ ان کے ساتھ خچروں کا سا ہی سلوک ہونا چاہئے، غریب لوگ غریب ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام کرتے ہیں، اگر انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے لگے تو اکڑ جاتے ہیں۔ غرضیکہ طبیعت بہت منغض رہی، ہم سب لوگ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے تھے، اور یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے، آخر کھانا کھانے کے بعد بھیالال کے لطیفوں سے طبیعت کسی قدر بہلی، گوربخش نے گراموفون پر چند دلکش ریکارڈ سنائے۔ اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گونج اٹھی

دس بجے کے قریب جب "برج" شروع کی گئی، تو میں دردِ سر کا بہانہ

کرکے اٹھ آیا ، دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا ، پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا ، پھر میں نے کچن میں جاکر پانی کا ایک گلاس پیا ۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی ۔ میں کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پہ آگیا ۔

زینی ہاتھ میں چپو لئے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی ، اور اس کے قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا ، نہیں وہ رو رو کر سو گیا تھا ، اس کی پلکوں پہ آنسو ابھی تک چمک رہے تھے ، اس کے لبوں سے اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی ۔

اور زینی ؟ ــــ وہ کیا سوچ رہی تھی ؟

کیا اس کی نظر جھیل کی وسعتوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی جہاں اس ظالم پردیس میں شاید کسی لکڑی اور کوئلے کی دوکان کے آگے اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا ، دن بھر کی محنت مشقت سے چور ایک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپ رہا تھا زینی کا چہرہ اداس تھا ۔ جیسے اس کی آنکھیں خلا میں کچھ دیکھ رہی ہوں

" زینی ! " میں نے آہستہ سے کہا

وہ خاموش بیٹھی رہی

" مجھے بہت افسوس ہے زینی ! "

" زینی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا ۔

" زینی تم گھبراؤ نہیں " میں نے آہستہ سے کہا

" صاحب " اب ہم کیا کریں گے ؟ " زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا " اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ۔ ایک خاوند تھا وہ پردیس چلا گیا

عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے

" میں عورت ذات ہوں

" ہائے اب کیا ہوگا ؟ "

زینی کی سسکیاں تیز ہو گئیں ، میں اس کے قریب جاکھڑا ہوا ، اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا " کیوں گھبراتی ہو زینی " تمہارا خاوند ضرور پردیس سے واپس آجائے گا ۔ اور

زینی نے روتے ہوئے کہا ۔ " صاحب میں مرجاؤں گی اور چھوٹا عزیزا بھی بھوکا مرجائیگا ، ہائے اس نے ہمیں دھوکا دیا ۔

" مت گھبراؤ زینی ، میں تمہارے لئے ۔ میرا مطلب ہے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں ، ہاں ، تم روتی کیوں ہو ، میری اچھی زینی مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے ، بے اندازہ محبت ۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما دیا ۔

جیسے چراغ جلنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند لپک پیدا ہوتی ہے اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی، لیکن پھر فوراً ہی بجھ گئی، تیل ختم ہو چکا تھا اور پھر غریبوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہی کہاں ہے، زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح میرے آغوش میں گر پڑی اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو میرے بازوؤں میں چھپا لیا ۔۔۔ اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی!!

چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، ستارے نادم تھے، وہ جہلم کی سطح پر باسی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے، ہوا کنول کے پتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آہیں بھر رہی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا
'تم نے ہمیں خرید لیا'۔

صرف ڈرائنگ روم سے گوربخش کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

پنڈارے

جمنا ساگرہ میں رہتی تھی، ساگرہ برہمنوں کا گاؤں تھا، اور ہزاروں برسوں سے چلا آتا تھا۔ کشمیر کے چھوٹے چھوٹے کہساروں میں یہ بھی ایک چھوٹے سے کہسار میں واقع تھا۔ اس کے درو د اربعہ میں صرف دو طرفیں پائی جاتی تھیں شمال مشرق اور جنوب مشرق دونوں اطراف میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے جو ایک تنگ بیضوی دائرہ بناتے ہوئے پھر آپس میں مل گئے تھے۔ سورج ہر روز ایک پہاڑ سے نکلتا اور دوسرے پہاڑ میں غروب ہو جاتا۔ کہسار کے اوپر اس تنگ بیضوی آسمان میں سورج کی حرکت ایک چھوٹی سی لکیر تھی اور یہ آڑی لکیر ہمیشہ بدلتی رہتی ساگرہ کے برہمن اس آڑی لکیر کو دیکھ کر موسم کی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا کرتے۔ گرمیوں میں اس آڑی لکیر کا پہلا سرا بالکل پہاڑی نالے کے منہ پر چلا جاتا تھا۔ اور دوسرا اس نقطہ پر جہاں پہاڑی نالہ دونوں پہاڑوں کی سمٹی ہوئی حدوں کی بیچ میں سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں مکی کی فصل بوئی جاتی تھی اور مکی کے کھیتوں کے کنارے کنارے کڑم کا ساگ اور مرچوں کے پودے نالے کے کنارے

کھیتوں میں پانی ہمیشہ کھڑا رہتا تھا، اس لیے یہاں دھان بویا جاتا تھا کبھی کبھی نالے میں بارش کا پانی بہت زوروں میں آجاتا تھا اور دھان کا ایک آدھ کھیت بہہ جاتا تھا لیکن جب سردیوں میں نالہ سکڑتا ہوا جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے جالگتا تھا۔ اس وقت ساگرہ کے برہمن نالے سے اپنا کھیت واپس لے لیتے تھے اور اگلے سال کے دھان کے لئے ایک آدھ کیاری اور بھی بنا لیتے تھے۔ اس طرح کرتے کرتے انھوں نے قریباً قریباً پہاڑی نالے کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہمیشہ جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے لگ کر بہا کرے۔ قریباً قریباً اس لئے کہ ساگرہ کا نالہ کبھی کبھی موقع پاکر براہمنوں کے حکم کی خلاف ورزی کر دیا کرتا تھا اور براہمن اسے کوئی سزا نہ دے سکتے تھے

ساگرہ میں دن کم آتے تھے اور راتیں زیادہ، اجلی روشنی اور چمکتی ہوئی دھوپ کم میسر آتی۔ دن کو اکثر ایک مگھی سی سفیدی چھائی رہتی اور رات کو گہری سیاہی جس میں کہیں کہیں تارے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح سلگتے اور سردیاں تو اکثر ایک لمبی رات ہوتی تھیں۔ جس میں بادل گھرے رہتے، برفیلی ہوائیں چلتیں اور کبھی کبھی بجلی کوند کوند جاتی۔ ساگرہ کی دو طرفیں تھیں اور دو ہی موسم گرمی اور سردی۔ یا ایک چھوٹی سی بہار اور ایک لمبی سی خزاں۔ اور فصلیں بھی دو ہی تھیں۔ مکی اور دھان، لمبی سی خزاں میں تو ساگرہ کے براہمن پردیس میں نوکری کی تلاش میں چلے جاتے۔ جہاں وہ اکثر باورچی رکھے جاتے

یا کسی دور دراز کی منڈی سے نمک لانے کے لئے روانہ ہو جاتے، یا گھر پر بیٹھ کر سوت اور کپڑا بناتے۔ عورتیں صلیب نما چرخوں پر گھوں گھوں کے ساتھ کاٹ کاٹ کر سوت کی انٹیاں اور مرد کچے گھروں کے لیپے ہوئے آنگنوں میں لکڑی کی کیلیں ٹھونک کر سوت کے تانے بانے سے اپنی پوشش کے لئے کپڑا تیار کرتے۔ روئی، چادریں، لوئیاں، لحاف، موٹا کھدر، اور اپنی نوجوان بہوؤں اور بہنوں اور بیویوں کے لئے سوت اور اون کو ملا کر ایک عمدہ پتلا سا کپڑا تیار کرتے، جس پر عورتیں سرخ تاگے سے بھدے اور بد نما پھول کاڑھ لیتی

ساگرہ کے گاؤں میں بمشکل ایک سو گھر ہوں گے، ان ایک سو گھروں کی حکومت، گاؤں کے سب سے بڑے بوڑھے براہمن کے سپرد تھی۔ وہ گاؤں کے نمبردار بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی اور گاؤں سے باہر بڑی سرکار کے سامنے گاؤں والوں کی نیکی بدی کا ذمہ دار اور ان کا مستقل نمائندہ اس گاؤں میں تو ہمیشہ ہزاروں سالوں سے بڑے بوڑھے براہمن مذہبی پیشوا اور نمبردار کی حکومت چلی آئی تھی، ہاں اس گاؤں سے باہر بہتوں کی حکومت آئی اور چلی گئی، آرئیے، منگول، تاتاری، تبتی، نیپالی، چینی، مغل، سکھ اور اب ڈوگرہ سرکار کی حکومت تھی، ڈوگرہ سرکار کے بزرگ اعظم گلاب سنگھ نے اسے مسلمان بادشاہوں کے کمزور ہوتے ہوئے ہاتھوں سے چھین لیا تھا اور پھر آخر ایک دن بڑی انگریزی سرکار نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ لے کر کشمیر پر ڈوگرہ

سرکار کا حق مان کر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی، لیکن ان باہر کی بدلتی ہوئی حکومتوں نے ساگرہ کے گاؤں والوں کو نہ کوئی فائدہ پہنچایا تھا اور نہ ہی کوئی خاص نقصان، سیکڑوں سالوں سے وہ اپنی فصل کی ایک تہائی یا چوتھائی ادا کرتے آئے تھے، اناج ہو یا لگان ایک ہی بات تھی۔ چوکیدارہ اور جنگل کا محصول اور پٹواری اور راکھے کا خرچ سب ان کے ذمہ تھا اور کبھی کبھی مالک بےگار بھی لے لیتا تھا، کیونکہ جو مالک ہے وہ بیگار ضرور لے گا۔ اور پھر گو سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی لیکن اگر تین یا چار ہوتیں تو بھی اس تخمینہ میں کیونکر فرق پڑ سکتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ کھانے کو دو وقت روٹی مل جاتی تھی اور پہننے کو کپڑا اور اگر روٹی کپڑے کی تنگی پیش آجاتی تو وہ بھگوان کی دیا سے پردیس جاکر نوکری کر سکتے تھے، کھانا پکا سکتے تھے اور اگر کھانا پکانا نہ جانتے تو جھوٹے برتن صاف کر سکتے تھے۔ اور دو تین روپوں کے عوض مرد آیا بن سکتے تھے۔ وہ اپنی قسمت پر نہ شاکر تھے۔ نہ رنجیدہ، وہ ہزاروں سال سے ایک ہی ڈگر پر جا رہے تھے، انھیں اس امر کا احساس ہی نہ ہوا تھا کہ ان کی قسمت اچھی ہے یا بری، کیونکہ انھوں نے ان کے بزرگوں نے کبھی اور کوئی قسمت دیکھی ہی نہ تھی

اس گاؤں میں جمنا رہتی تھی، جمنا کا خاوند کھیتی باڑی بھی کرتا تھا اور دکان کا کام بھی، سارے گاؤں میں صرف یہی ایک دوکان تھی، اور ساگرہ کے چھوٹے سے کہسار میں ندی کے جنوب مغربی سرے پر واقع تھی۔ جہاں سے ایک

پگڈنڈی باہر سے آتی ہوئی ساگرہ کے گاؤں کے قریب نالے کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی اوپر شمال مشرقی کہساروں میں چلی جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے ذریعہ سے ساگرہ کا تعلق باہر کی دنیا سے ہوتا تھا۔ اور اسی پگڈنڈی پر جمنا کے مرحوم خاوند کی دوکان تھی۔ وہ ایک دن پہاڑی نالے کو عبور کرنے کی کوشش میں بہہ گیا تھا اور نالے کی طغیانی اور بڑی بڑی چٹانوں کے نکیلے کونوں نے جو پانی میں چھپے ہوئے تھے اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کو توڑ دیا تھا۔ اس کے بازوؤں کی انگلیوں کو اوکھلی میں صاف کئے دھان کی طرح چھیل دیا تھا۔ پرمیشر کی مرضی تھی کہ اس غریب براہمن کی موت اس طرح واقع ہو یا اس براہمن کے پچھلے کرموں کا پھل تھا اور اس کی جوان بیوہ کے نحس ستاروں کا یا اس کے ننھے سے لڑکے کا جس کی عمر اب ایک سال کی تھی۔ جمنا اپنے خاوند کے مرنے پر ستی نہ ہوئی تھی، وہ بہت چیخی چلائی بھی نہ تھی۔ خاوند کے مرجانے سے زیادہ اسے اپنے بیوہ ہو جانے کا غم تھا، وہ اب پھول سے کاڑھے کپڑے نہ پہن سکے گی۔ چاندی کی بالیاں اور باہوں کے کڑے اور کانوں کے دو جوڑے اسے اتارنے ہوں گے۔ اس کی رگوں میں شباب کی سرخی کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو اور وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی یہ سوچ کر کہ اب کوئی اس کے نرم و گداز جسم کو اپنے چھاتی سے نہ لگا سکے گا، اس کے پتلے سے سرخ لبوں اور لمبی

سرمئی پلکوں کی صف کو نہ چوم سکے گا۔ وہ بیتاب ہو گئی تھی۔ اسے اپنے خاوند پر بہت غصہ آیا تھا اور اس نے شنبو جی کے پرانے مندر میں جا کر اپنے آپ کو دہلیز پر گرا دیا تھا۔ اور گڑگڑا کر مقدس دیوتا سے پوچھا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ظلم کیوں ہوا تھا۔ لیکن مقدس دیوتا نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا یا شاید وہ مقدس دیوتا کا جواب سمجھنے سے قاصر رہی تھی، کچھ بھی ہو اس وقت بھگوان کے جواب سے جمنا کی تسلی نہ ہوئی تھی، بعد میں بوڑھے براہمن کے سمجھانے پر جمنا کا غصہ جاتا رہا۔ آہستہ آہستہ محض زندہ رہنے کی جبلی خواہش اس کے باقی جذبات پر غالب آ گئی۔ اس نے اپنے خاوند کی دوکان سنبھال لی اور کھیتی باڑی کا کام ایک اور براہمن کے سپرد کر دیا گاؤں کے نمبردار اور دیگر بوڑھے پنچوں نے جمنا کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ دوکان بھی کسی اور آدمی کے سپرد کر دے اور خود شنبو جی کے مندر میں بیٹھ کر بھگوان کی یاد کرے وہ خود اس کے لڑکے کی نگہداشت کر لیں گے۔ یوں بھی تو ایک براہمن عورت کا دوکان پر بیٹھنا معیوب ہوتا ہے۔ اور پھر جب وہ عورت ایک جواں سال بیوہ ہو اور جمنا جیسی حسین، لیکن بدبخت جمنا نے ایک نہ مانی۔ اس نے دوکان کا کام نہایت اچھے اصولوں پر شروع کیا۔ وہ مسافروں سے نہایت خوش خلقی سے پیش آتی تھی اور گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی تھی، اس کے خاوند کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اور اب اس کی زندگی ایک ہندو بیوہ کی زندگی کی طرح حزیں اور افسردہ نہ تھی بلاشبہ بہت سے گاؤں کے بزرگ اس امر کو پسند نہ کرتے تھے

لیکن جمنا کو اس کی پروا نہ تھی۔ اس کا لڑکا اب دو سال کا تھا۔ اور اب وہی اس کی زندگی کا مرکز تھا، وہ صبح شام مندر میں پوجا کرنے جاتی اور دیوتا سے اپنے پیارے بچے کی زندگی اور صحت کا بردان مانگتی۔ اب اس کے دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا اکھڑے اکھڑے قدم جم گئے تھے صرف دل میں ایک ہلکی سی چبھن ایک خفیف سی خلش رہ رہ کر جاگ اٹھتی تھی کہ جب کبھی مسافر اسے ترستی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس وقت اس کے گالوں کی رنگت شہابی ہو جاتی اور تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا۔ اور وہ اپنے سارے بدن میں ایک سنسنی محسوس کرتی۔ یہی سنسنی اسے سردی کے سنسان راتوں کے اندھیارے میں محسوس ہوتی جب اسے اپنے خاوند کا پیار یاد آتا اور وہ ایک لمبی سانس لیکر اپنے سوئے ہوئے بچے کے ننھے ننھے بازو اپنے چھاتیوں پر پھیلا لیتی اور اس کا منہ زور زور سے چومنے لگتی۔ حتیٰ کہ سویا ہوا بچہ جاگ کر رونے لگتا۔ یہ لمحے بہت تکلیف دہ ہوتے تھے۔ لیکن جمنا کو پورا یقین تھا کہ وہ بہت تھوڑے عرصہ میں ان پر پورا قابو پا لے گی اور یہ اغلب تھا کہ وقت گذرنے پر جب شباب کا بہاؤ مدھم ہو جائے تو یہ تیز اور جنسی خلش بھی ہمیشہ کے لئے دب جائے

لیکن انہیں دنوں میں علاقے کے تحصیلدار صاحب نے اپنے دورہ کے لئے ساگرہ کا مقام تجویز کیا۔

ساگرہ میں تحصیلدار کا دورہ پر آنا گاؤں والوں کے لئے ایک اچنبھے کی بات تھی۔ کیونکہ اس دور افتادہ مقام میں افسر لوگ بہت کم دورے پر آتے تھے

اور اکثر برسوں گذر جاتے اور گاؤں والوں کو اپنے حاکموں کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ یوں بھی انھیں اپنے مالکوں سے کوئی خاص پیار نہ تھا۔ اور وہ یہی بہتر سمجھتے تھے کہ انھیں الگ تھلگ رہنے دیا جائے۔ وہ اپنے براہمن اور بڑی سرکار کے [illegible] احکام کی پوری تابعت کرتے رہیں گے اور پھر یہ تو ان کی خوش نصیبی ہی تھی کہ ساگرہ ایک ایسی حقیر سی تنگنائے میں واقع تھا جہاں کسی افسر کا دل آنے کو نہ چاہتا تھا۔ تنگ سی وادی، سنگلاخی پہاڑ، ان کے نیچے دیوداروں کے گھنے جنگل، اور دیوداروں کے نیچے چیڑھ اور دیار اور ان کے نیچے چند کھیت، چراگاہیں اور گاؤں دہقانوں کے کھیت اور سب سے نیچے پہاڑی نالہ ایک چور کی طرح اس وادی میں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ براہمنوں کے گاؤں میں قتل و خون کہاں؟ اس نے سیکڑوں برسوں سے یہاں کسی نے پولس کے آدمی کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ جگہ بہت مایوس کن تھی۔ زمینوں کے جھگڑے یہاں براہمن پنچ آپس ہی میں طے کر لیتے تھے۔ غرضیکہ افسر لوگوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ان حالات میں تحصیلدار صاحب کا دورہ پر آنا یقیناً ایک اچنبھے کی بات تھی۔ تحصیلدار ایک گٹھیلا، سجیلا، خوب رو جوان تھا، چوڑی چھاتی مضبوط تھوڑی اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھیں۔ جب جمنا نے اسے اپنی دوکان کے سامنے سے گھوڑے پر سوار گزرتے ہوئے دیکھا تو دنگ رہ گئی، ساگرہ کے براہمن تو اس کے سامنے بالکل مریل ٹٹو سے دکھائی دیتے تھے۔ تحصیلدار نے ایک خاکی رنگ کی برجس

پہن رکھی تھی اور سبز خاکی ٹوپی، اور ہاتھ میں بید کی چھڑی جس کے سرے پر ایک چمڑے کا پھندنا لگا ہوا تھا۔ اس کی ہر بات عجیب تھی اور جب اس نے نگاہ پھیر کر جمنا کی طرف دیکھا تھا تو جمنا کا رواں رواں کانپنے لگا تھا۔ وہ اس وقت ترازو میں مصری تول کر ایک مسافر کو دے رہی تھی۔ اور وہ ترازو چند لمحوں کے لئے اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا رہ گیا تھا۔

دن بھر تحصیلدار صاحب نے چیڑھوں کے ایک تپلے جھنڈ کے نیچے اپنا دربار لگایا، وہ خود ایک بید کی کرسی پر بیٹھے اور گرداور، قانون گو، اور منشی، معتمدی ان کے پاؤں کے قریب زمین پر۔ اس طرح حاکموں کے دربار میں ساگرہ کی رعیت کی پیشی ہوئی۔ غریب براہمن ڈر سے مرے جا رہے تھے جس طرح ہر بشر اپنے خدا سے ڈرتا ہے اور رجاو بیجا اس کی خوشامد و چاپلوسی پر تلا رہتا ہے، اس طرح بلا ماسٹر کی گھڑکی سے ڈرے ہوئے بچوں کی طرح تحصیلدار کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور منشی اور معتمدیوں کی خوشامد کر رہے تھے۔

منشی عبدالرحمان نے اپنی مولویانہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اے حرامزادو، وہ گھاس کے گٹھے ابھی تک نہیں پہنچے،"

راجہ رام براہمن ہاتھ جوڑ کر بولا "حضور میں خود ابھی چار گٹھے گھاس کے باندھ کر لایا ہوں۔"

منشی عبدالرحمان نے گرج کر کہا "حضور کے نیچے چار گٹھوں سے کیا

کیا ہوتا ہے" پھر تحصیلدار صاحب کی طرف مڑ کر بولا۔ "حضور سالہا سال سے کسی افسر نے اس علاقہ کا دورہ نہیں کیا، اب اس کا نتیجہ دیکھیے۔ حضور کے تشریف لانے پر گھاس کے صرف چار گٹھے پیش کیے جاتے ہیں۔ اور مرغی ایک بھی نہیں۔ یہاں کے لوگ کتنے خودسر ہو گئے ہیں۔

نمبردار نے ڈرتے ڈرتے عرض کی "حضور! منشی صاحب یہ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ یہاں ہم لوگ نہ مرغیاں پالتے ہیں نہ کھاتے ہیں اور کوئی دوسرا گاؤں نزدیک نہیں۔

گھسیٹا رام پیشکار نے چلا کر کہا "یہ کتا برہمن کیا بکواس کرتا ہے باندھ دو اسے درخت سے اور لگواؤ کوڑے۔ تاکہ اسے افسروں کے سامنے بات کرنے کا سلیقہ آ جائے۔

بڑھا برہمن کانپنے لگا۔ تحصیلدار صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ہنسنے لگے۔ بولے۔ "نہیں، نہیں، یہ بیچارہ سچ کہتا ہے۔ اچھا تم یہاں کے نمبردار ہو نا؟"

"جی"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

ست نرائن حضور۔"

تحصیلدار صاحب پھر مسکرا دئے۔ "تم بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو

ست نرائن۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ آج رات کو ہمارا کیمپ کہاں لگے گا۔"

نمبردار نے فوراً جواب دیا۔ "جو جگہ حضور پسند فرمائیں، وہی۔

تحصیلدار صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے میرے خیال میں اس بڑی دوکان کی چھت اچھی رہے گی۔ وہ دوکان جو ہم نے پیچھے راستے میں دیکھی تھی۔

ست نرائن بولا۔ "وہ حضور جمنا بیوہ کی دوکان ہے۔"

"ہاں، ہاں، وہی ـــــ اچھا ـــ وہ ـــ جمنا بیوہ کی دوکان ہے ـــ جمنا۔"

"ہاں حضور وہ بیوہ ہے، پارسال اس کا خاوند رام بھروسے اس نالے میں بہہ گیا تھا۔

تحصیلدار صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ہاں، ہاں تو پھر وہی جگہ بہتر ہے۔ کیوں پیشکار صاحب؟"

پیشکار صاحب نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ "بجا فرمایا حضور نے، کھلی جگہ ہے، کشادہ چھت ہے، گاؤں سے باہر بھی ہے، کھلی ہوا بھی ہے،"

" ست نرائن بولا۔ "جیسی مرضی حضور کی، لیکن اگر حضور چاہیں؟ تو میرے مکان کی چھت پر اپنا خیمہ لگوا لیں۔ وہ چھت اس سے بھی زیادہ کھلی اور کشادہ ہے۔

پیشکار بولا: "نہیں، نہیں وہی جگہ بہتر رہے گی۔"

اور منشی عبدالرحمان نے ایک آنکھ میچ کر آہستہ سے پیشکار کے کان میں کہا، "میں اس لونڈے کی مذاق کی داد دیتا ہوں، کمبخت نے کیسی حسین مرغی تلاش کی ہے۔" اور یہ کہہ کر اپنی گنجی کے ایک دو بالوں کو سہلانے لگے۔

جنا نے وہ رات ست نرائن نمبردار کے گھر بسر کی دوسرے دن وہ دکان پر بھی نہ گئی تیسرے دن تحصیلدار صاحب کا خیمہ بدستور اس کی دوکان کی چھت پر لگا ہوا تھا۔ اسی طرح سے ایک دو دن اور گذر گئے اور تحصیلدار صاحب کو شاید ساگرہ اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ اس گاؤں سے ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ دن بھر دیودار کے جنگلوں میں شکار کیا کرتے تھے، ریچھ اور سور مارتے یا جنگلی کبوتر، اور شام کو اپنا دربار لگاتے، جہاں گاؤں والوں کی پیشی ہوتی تھی اور گاؤں کے مالیانے اور معافی کے متعلق تفتیشیں نکالی جاتی تھیں، اور تحصیلدار صاحب کا اندازہ تھا کہ اس گاؤں کا مالیانہ بڑھنا چاہئے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اس گاؤں کے براہمن بہت بدمعاش ہیں۔ اور جنگل میں بہت چوری کرتے ہیں۔ بلا اجازت لکڑیاں کاٹتے ہیں۔ بنفشہ اکھیڑ لاتے ہیں۔ اناردانہ تیار کرتے ہیں۔ وہ ضرور جنگلات کے محکمے کو لکھیں گے کہ ان چیزوں کا انسداد ہو، اور پھر یہاں گاؤں والوں نے بلا اجازت بہت سی سرکاری زمین کاشت کر لی تھی اور اب پٹواری ان تمام اشخاص کو چھ چھ مہینے کے لئے جیل میں بھیجدیں گے۔ اور

اور ان کی زمینیں اور مکان قرق کریں گے اور پھر اس حرامزادے نمبردار نے پچھلے سال کا بقایا لگان ابھی تک ادا نہیں کیا تھا کم از کم انھیں بہت شک تھا کہ آیا وہ پچھلے سالوں میں باقاعدہ لگان ادا کرتا رہا تھا اور گرداور قانون گو اور پٹواری مناسب تحقیقات کے بعد تحصیلدار صاحب کے سامنے رپورٹ پیش کریں گے اور تحصیلدار صاحب نے تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے بددیانت نمبردار کو موقوف کر دیا جائے اور ڈھائی سال کے لئے جیل میں ٹھونس دیا جائے ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اور پیشکار صاحب کی مربیانہ اور مشفقانہ صلاح و مشورہ کے ساتھ ساگرہ کے براہمنوں نے گاؤں کی تین نوخیز بہوئیں، رام دئی، دلاری، اور کھیتری اپنے ارضی دیوتاؤں کو نذرانے میں پیش کیں۔ کیونکہ انسان کو اپنی عزت و ناموس سے اپنی جان زیادہ پیاری ہوتی ہے، اور غریب کسانوں کی زندگی کا دارومدار چاہے وہ براہمن ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی زمین ہے جسے کاشت کرکے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور جب یہ زمین ہی قرق ہو گئی۔ یا مالکوں نے اپنی زمین واپس لے لی تو پھر وہ غریب لوگ کیا کر سکتے ہیں، پیٹ کی مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے لیکن جنا کے دل میں نہ جانے کس نے کیا پتھر کے ٹکڑے بھر دئے تھے وہ کمبخت ایک ہی ہٹ پہ قائم تھی کہ وہ بھوکی مر جائے گی، چاہے اس کی زمین قرق ہو جائے چاہے اس کی دوکان ضبط کر لی جائے، لیکن وہ تحصیلدار کے پاس نہ جائیگی کبھی نہ جائے گی، اسے اپنے مرنے والے خاوند کی سوگند، اپنے ننھے بیٹے

کی قسم"

لیکن جنا کی یہ ہٹ گاؤں والوں کے حق میں مفید نہ تھی، اب تو گاؤں کے دو ایک بوڑھے براہمنوں کی بے عزتی بھی کی جا چکی تھی، ان کی سفید داڑھی کو نوچا گیا تھا اور ان کی گاڑھے کی موٹی موٹی پگڑیاں اتار کر ان کی چندیا پہ اتنے دھپ لگائے گئے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، اور یہ سب کچھ لگان اور آب پانے اور سرکاری زمین پر خلاف قانون قبضہ جمانے کے سلسلے میں ہوا۔ رام دئی، دلاری اور کھیتری کی قربانی کے بعد بھی ارضی دیوتاؤں کی بھوک نہ مٹی تھی۔ یوں تو تحصیلدار صاحب اپنی زبان سے کچھ نہ کہتے تھے، لیکن دیوتاؤں کو کب کسی نے بولتے دیکھا ہے۔ وہ خاموش رہتے ہیں۔ لیکن پجاری جانتا ہے کہ اس کے اشٹ دیو کو کس چیز کی بھینٹ چاہئے ساگرہ کے گاؤں والے بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ بیحد پریشان تھے، کیا کریں کیا نہ کریں، اپنے گھر کی لڑکی، بہن، یا بہو ہوتی تو اسے کسی طرح راضی کر لیتے لیکن جنا، بیوہ جنا تو ایک ہی کم ذات عورت تھی۔ نہ وہ دوکان پر بے شرم، بے حیا بن کر مردوں کی طرح کام کرتی، نہ آج یہ نوبت آتی یہ سب آفت اسی کی وجہ سے آئی تھی اور یہ آگ اسی نے لگائی تھی، گھاس کے گٹھے پہنچاتے دوسرے گاؤں سے انڈے اور مرغیاں لاتے لاتے اور مکھن اور آٹا اور باسمتی کے خوشبودار چاول دیتے دیتے وہ غریب براہمن بہت تنگ آ

تھے، اور دن رات سوچتے تھے کہ جنا کو کس طرح منایا جائے، رام دئی، دلاری اور کھیتری نے اس کے آگے اپنے دکھوں کا رونا رویا اور بتایا کہ کس طرح اس کے لئے محض اس کے لئے اس کی عصمت تباہ و برباد کی گئی اور اب بھی وہ گاؤں والوں کو بے شرمی بے حرمتی، اور بے حیائی سے بچا سکتی تھی۔ اگر وہ ——— اگر وہ ——— مان جائے۔ آخر اس مصیبت کے وقت وہ گاؤں والوں کے کام نہ آئے گی۔ کیا وہ اتنی قربانی بھی نہ دے سکتی تھی۔ اور پھر اسے طعنہ دینے والا کون تھا۔ وہ تو ایک بیوہ ہی تھی۔

جنا نے جھلا کر کہا، ہاں، ہاں، میں بیوہ ہوں، اسی لئے تو تم مجھے اپنی خود غرضیوں کا آلۂ کار بنانا چاہتی ہو۔ اگر آج میرا خاوند جیتا ہوتا تو تمہاری طرح باتیں کرنے والیوں کی زبان کھینچ لیتا اور تمہاری چوٹی پکڑ کر اس طرح گھسیٹتا کہ تمہارے یہ موم سے چکنے ہوئے سر ایک گھڑی میں گنجے ہو جاتے۔ کلموہیاں اپنی عصمت کو بیچ کر اب مجھ سے سودا کرنے آئی ہیں۔ اور کھیتری نے غصہ میں چلا کر کہا۔ " یہ آج تم باتیں کر رہی ہو میں کہتی ہوں اگر آج تمہارا خاوند زندہ ہوتا تو وہ تمہاری چوٹی پکڑ کر خود اس موئے تحصیلدار کے پاس لیجاتا۔ اس طرح کہ جس طرح ہمارے خاوند ———

اور کھیتری آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ غم و غصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اسے روتے دیکھ کر رام دئی اور دلاری بھی رونے لگیں اور پھر جنا بھی۔

دوسرے دن جمنا کا دل ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ وہ جائے یا نہ جائے ایک طرف کنواں دوسری طرف کھائی، وہ خود دیکھ رہی تھی کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بزرگوں کی کس طرح بے عزتی و بیحرمتی کی جا رہی تھی۔ اس اس امر کا بھی ڈر تھا کہ لگان بڑھ جائے گا اور گاؤں والے اسے کوسیں گے۔ بہتوں کو سزا ہوگی۔ کئی جیل کی ہوا کھائیں گے؟ جیل۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ خودکشی کرے۔ پھر تو گاؤں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ لیکن اس کا ایک ننھا سا لڑکا تھا اور خود بھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ خیال اسے صرف ایک لمحہ کے لئے آیا تھا۔ اور دوسرے لمحے میں اس نے اسے رد کر دیا۔ آخر ہوگا کیا؟ کیا وہ گاؤں والوں کے لئے یہ قربانی نہ کر سکتی تھی، یہ ایک قربانی ہی تھی جیسا گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے اسے بتایا تھا اور دھرم شاستروں میں اس نے پڑھا تھا، ایسی قربانیاں جائز سمجھی جاتی ہیں۔ یہ یقیناً پاپ نہ ہوگا۔ بوڑھے نمبردار نے اپنی پگڑی اتار کر جمنا کے پاؤں میں رکھ دی تھی، اور اس نے گلوگیر آواز میں التجا کی تھی کہ گاؤں کو اس مصیبت سے بچا لے، تحصیل والوں کی سختیاں ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں اور اگر یہی حالت رہی تو چند دنوں میں اس گاؤں میں گھاس کا ایک تنکا نہ ملے گا اور ان کے ڈھور ڈنگر موسم سرما میں بھوک سے مر جائیں گے۔ عجیب حالت تھی۔ اس مصیبت سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا۔ کیا وہ اپنے بوڑھے بزرگ کی استدعا کو رد کر دے گی۔

جمنا یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ اس نے چادر سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور زمین سے گھاس کے تنکے توڑنے لگی۔

دوسرے دن تحصیلدار صاحب ساگرہ سے رخصت ہو گئے۔ وہ بوڑھے نمبردار سے نہایت ملاطفت آمیز انداز سے پیش آئے اور انھوں نے وعدہ کر لیا کہ نہ تو وہ لگان بڑھائیں گے۔ اور نہ ہی کسی کو جیل کی ہوا کھلائیں گے بلکہ وہ بوڑھے نمبردار کے لئے ذیلداری کی سفارش کریں گے۔ یکایک انھیں احساس ہوا کہ اس گاؤں کے لوگ بہت شریف الطبع مہمان نواز اور سرکار کے وفادار تھے۔ اور وہ حکام بالادست کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔ منشی عبدالرحمان اور پیشکار گھسیٹا رام بھی بہت خوش تھے۔ گاؤں کے پنچوں نے ان کی مٹھی بھی گرم کر دی تھی۔ تحصیل والے بھی خوش تھے اور تحصیل کے جانور بھی جنھیں تازہ گھاس اور نئی مکی کے دانے ہر روز کھلائے گئے تھے۔ جب تحصیل والوں کا قافلہ گاؤں سے چلا تو کئی من باسمتی کے خوشبودار چاول خچروں پر لدے ہوئے تھے ایک بڑے ٹوکرے میں ایک مزدور مرغیاں لئے جا رہا تھا جو پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی بار بار کڑکڑاتی تھیں، دو براہمن تحصیلدار صاحب کی گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھے۔ اور تحصیل کے باقی اہلکاروں کے ساتھ بھی اسی طرح ایک ایک آدمی لگام تھامے چلا آرہا تھا۔

گاؤں کی حد سے باہر آ کر پیشکار نے عرض کی۔ حضور موضع کلاتھنہ چند ایک انتقال کی مسلیں ہیں۔ یہاں سے کوئی دس کوس ہوگا۔

گھوڑوں کی باگیں موضع کلاتھنہ کی طرف موڑ دی گئیں۔ پتلی سی پگڈنڈی پر چلتا ہوا یہ لمبا سا قافلہ خود پنڈاروں کا گروہ معلوم ہوتا تھا۔ جو نہتی رعایا سے اپنی خون آشامیوں کا خراج وصول کرنے جا رہا ہو۔ پگڈنڈی ایک اونچے پہاڑ کے گرد چکر کھاتی ہوئی اوپر اٹھتی ہوئی جا رہی تھی۔ قافلہ چلتا گیا اور خائف براہمن خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ انہیں یقین نہ ہوا کہ تحصیل والے ان کے گاؤں سے چلے گئے ہیں۔ اور پھر شاید کئی برس تک ادھر نہ آئیں گے۔ انہیں خیال ہوا کہ جب وہ واپس اپنے گاؤں میں جائیں گے۔ تحصیل والوں کو بدستور وہاں موجود پائیں گے، بوڑھے نمبردار نے سوچا کہ تحصیل والوں کی آمد اس گاؤں کے لئے کسی بڑی سماوی آفت کا پیش خیمہ تھی اور یہ آسمانی دیوتاؤں کا قہر بجلی بن کر ساگرہ پر ٹوٹے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔ لیکن پنڈارے اپنا خراج وصول کر چکے تھے۔ اور اب وہ موضع کلاتھنہ کی سمت جا رہے تھے اور انہوں نے مڑ کر ایک بار بھی موضع ساگرہ کی طرف نہ دیکھا۔ جسے انہوں نے اب ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح پھینک دیا تھا آہستہ آہستہ یہ قافلہ چلتا ہوا اوپر پگڈنڈی پر پھیلے ہوئے کثیف بادلوں کے غلاف میں غائب ہو گیا اور ساگرہ کی مٹی کے بے جان بتوں میں حرکت پیدا ہوئی خشک

لبوں پر زبانیں پھرنے لگیں۔ لمبی لمبی آہیں اور آرام کے سانس،

اس انسانی سماج میں جہاں یک جہتی اور مساوات نہیں ظلم کی اندھی رو اوپر سے آتی ہے اور برق کی تیز رفتاری کے ساتھ منتقل ہوتی ہوئی سماج کی نچلی تہوں میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کی ٹھوکر سب سے زیادہ خوفناک شدید اور قہرمانی ہوتی ہے۔ سماج کے اندھے نظام کا وہ عتاب جو ساگرہ کے براہمنوں پر نازل ہوا ایک بجلی بن کر جمنا پر ٹوٹا، جمنا وہ سوہنے کی مورت کی طرح چمکتی ہوئی جمنا، جس نے اس رات گاؤں والوں کی خاطر اپنے شباب کی تمام رعنائیاں پنڈاروں کے سردار کی حریص آغوش میں موتیوں کی طرح بکھیر دی تھیں۔ وہی جمنا آج تحصیل والوں کے چلے جانے کے بعد بوڑھے براہمنوں کے غم و غصہ کی شکار ہوئی۔ اگر جمنا یہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنی قربانی سے گاؤں والوں کو شکور کر دیا تھا تو یہ اس کی بڑی بھول تھی۔ اگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس نے کوئی نیک کام کیا تھا تو یہ اس کی غلطی تھی۔ اگر گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا تو یہ ایک فرض تھا جو بوڑھے نمبردار پر گاؤں کو بچانے کے لئے اس پر عائد ہوتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ وہ عورت جس کے برہنہ حسن کے بدولت ان پر یہ آفت آئی تھی۔ یوں گاؤں میں دندناتی پھرے اور آئے دن گاؤں والوں کو مصیبت میں پھنساتی رہے کیونکہ جب ارضی دیوتا کے منہ کو خون لگ جاتا ہے تو اس کی حرص بڑھ جاتی ہے اور گو سب دیوتا

زبان نہیں رکھتے لیکن سب دیوتاؤں کی نگاہیں ایک ہوتی ہیں لیکن کیا پھر یہ ممکن نہ تھا کہ تحصیلدار صاحب کے بعد تھانیدار صاحب تشریف لے آئیں اور تھانیدار کے بعد جنگل کا فارسٹر یا محاصلات کا افسر۔

چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد گاؤں کی برادری نے فیصلہ کیا کہ جنا کو برادری سے خارج کیا جائے، اسے اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیا جائے۔ اس کی دوکان سے سودا سلف نہ خریدا جائے۔ اس کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے چشمے سے پانی نہ بھرنے دیا جائے۔ گاؤں کی کوئی عورت اس سے کلام نہ کرے اور جنا کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ جلد سے جلد گاؤں کو چھوڑ کر چلی جائے برادری نے اس کے علاوہ ایک بھاری یگ کرنے کا فیصلہ کیا جہاں سب گاؤں والے پرائشچت کریں گے، اور جہاں رام دئی، ولاری اور کھینتری کو نیا جنم دیا جائے گا۔ اور شوجی مہاراج کے مقدس مندر کے گرد ایک سو ایک دفعہ پرکرما کر کے دعا کی جائے گی کہ ساگرہ کے باشندے آئندہ اس قسم کے عتاب سے محفوظ رہیں۔

شاید جنا کا دل اس غیر متوقع چوٹ کو نہ سہہ سکا۔ اسے پھر کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور اس کی روح نہایت سختی سے کچلی گئی ہے کیونکہ اب اس کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک غیر معلوم سی شئے

لطیف جو پہلے تھی اب نہیں ہے۔ اور کسی نے یکا یک گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا ہے۔ اس باطنی خلا کو گاؤں والوں کے ظلم و تشدد نے اور بھی تیز کر دیا، چند دن وہ کھوئی کھوئی سی رہی، اس کی آنکھوں میں آنسو نہ رہے نہ اپنے بچے کے لئے ہلا سا پیار جب عورتیں چشمے پر پانی بھرنے کے لئے مٹی کی گاگریں اٹھائے ہوئے اس کی دوکان کے سامنے سے گزرتیں تو ان کے طعن و تشنیع کے تیر اس کے زخمی جگر کے آر پار ہو جاتے لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں تھے جو اس کے رخسار پر ڈھلکتے اور اس کی روح کو سیراب کر سکتے، چند ہی دنوں میں اس کا شباب مر گیا، جوانی تھی، حسن تھا، دلفریبی تھی، لیکن روح غائب ہو گئی تھی، اور جس دن پرائشچت کا یگ رچایا گیا، اور نیلے آسمان اور ہرے کھیت اور ان عورتوں کے گانے اور ان کے نئے لباس اور بچوں کے دلکش قہقہوں نے اس کی روح کو لرزا دیا تو وہ بیقرار ہو گئی۔ اور بھاگی بھاگی بوڑھے نمبردار کے پاس پہنچی اور اس کے پاؤں پر جا گری۔ لیکن نمبردار نے اپنے مقدس پاؤں پرے کھینچ لئے اور اسے درشتی سے جھڑک دیا۔ اور کہا کہ وہ ایک ناپاک عورت تھی اسے کوئی حق نہ تھا کہ وہ یگ میں شامل ہو کر پرائشچت کر سکے۔ برادری کا فیصلہ سب کے لئے یکساں تھا۔

دن بھر یگ ہوتا رہا اور بوڑھے براہمن سنسکرت اور ہندی کے ملے جلے غلط اشلوک بولتے رہے ہون اور ساگری کا خوشبودار دھواں

اوپر آسمان کی طرف اٹھتا رہا، کھیتری، دلاری، رام دیئی نے نیا جنم لیا۔ گاؤں کے ہر ایک فرد نے پرائشچت کیا۔ گھی مکی کا آٹا اور گڑ کا بنا ہوا حلوا تقسیم کیا گیا۔ لیکن جمنا کو کسی نے نہ پوچھا اور نہ ہی اسے یگ منڈپ کے نزدیک آنے دیا۔

شام کو شوجی کے مندر کے گرد پرکرما کر کے اور سنکھ اور گھڑیاں بجا کر مندر کے کواڑ بند کر دیے گئے۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، بہت دیر کے بعد جمنا شوجی کے مندر کے قریب آئی، وہاں کوئی نہ تھا۔ مندر کے کواڑ بند تھے، اس نے چاہا کہ وہ بھی مندر کے گرد پرکرما کرے۔ لیکن اسے کواڑ کھولنے کا اب حوصلہ نہ ہوا وہیں دروازہ کے باہر کھڑی ہو کر اپنی گردن میں اپنے سر کی اوڑھنی ڈال لی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، وہ بہت دیر وہاں کھڑی رہی، سورج کی آخری کرنوں کا طلائی جال چیڑھ اور دیودار کے درختوں پر پھیلتا ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں پہ جا پہنچا اور پھر شفق کی ایک آخری خونی لکیر میں مبدل ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سرخ لکیر بھی غائب ہو گئی، اور پہاڑ اور ان کا سبزہ، اور وادی اور کہسار نیلے اور سیاہ رنگوں کے ایک عجیب سے امتزاج کھو سے گئے۔ اور ان کے نقش ہر لحظہ غیر معین اور غیر واضح ہوتے گئے۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں جمنا کے دل نے بار بار مندر کے معبود سے پوچھا کہ آخر کیا اس کے گناہ کا کوئی کفارہ نہ تھا؟ کیا وہ سچ مچ گاؤں والوں سے زیادہ گناہ گار اور قصوروار تھی؟ لیکن جب اس کے بار بار پوچھنے پر مندر کے معبود نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور مندر کے کواڑ نہ کھلے اور رات کی تاریکی

میں شوجی کا مقدس مندر اس پر ہنستا ہوا معلوم ہوا تو یکایک اس کے ایمان کی دیواریں گر گئیں۔ اس کا زخمی غرور اس کے دل میں ایک کچلے ہوئے پھنیر کی طرح بلند ہو گیا اور وہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ آئی۔

وہ پگڈنڈی جو گاؤں سے باہر گھاٹیوں اور جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی، رات کی تاریکی میں امید کی آخری کرن کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس رات ساگرہ کے کسی برہمن نے اس پگڈنڈی پہ گزرتی ہوئی کسی عورت کو نہیں دیکھا جس کے بال کھلے تھے اور جس کی گردن میں ایک میلی اوڑھنی کے دو پلو لہرا رہے تھے۔ اور جس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ غم، نہ یاس، نہ امید، نہ زندگی تھی، نہ موت، اور جو تیز تیز قدموں سے بھاگی جا رہی تھی۔ اس عورت کو کسی کا ڈر نہ تھا، اس عورت کو کوئی روکنے والا نہ تھا، پہاڑوں کی فضاؤں میں ایک ایسی ہیبت ناک خاموشی گھلی ہوئی تھی، جیسے وہ کسی کی مٹتی ہوئی زندگی کا آخری منظر دیکھ رہے ہوں ایک ایسا ہولناک سناٹا، جس کے پس پردہ کسی آنے والے طوفان کی گونج سنائی دیتی تھی

لیکن اس رات ساگرہ کے کسی برہمن نے اس پگڈنڈی پہ گزرتی ہوئی عورت کو نہیں دیکھا، ہاں چند روز کے بعد انھوں نے سنا کہ موضع کھمری راڑھ کے قریب ایک ندی کے نشیب میں ایک نوجوان عورت کی لاش پائی گئی۔ اس کا حلیہ جمنا سے ملتا جلتا تھا۔ گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے جمنا کے لڑکے کی پرورش کا ذمہ اپنے تئیں لیا اور جمنا کی زمین اور دوکان بھی اپنے قبضہ میں لے لی۔

جہلم سے پہلے جہلم کے بعد

جو سڑک سری نگر سے گل مرگ کی طرف جاتی ہے۔ وہ دورویہ شمشاد کے خوبصورت پیڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ سڑک دھان کے کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کے زمرد ندیاں دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی بہہ رہی ہیں۔ کھیتوں کے کنارے جہاں کہیں پانی ٹھہر گیا ہے یا چلتا پھرتا سا تھم سا گیا ہے۔ وہاں کنول اور کمھی پیالے کھلے ہوئے ہیں۔ سپید، گلابی، زرد، اور کہیں کہیں چناروں کے نیچے گڈریے گائیں، بھیڑیں چرا رہے ہیں۔ چار چار عورتوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی دھان کوٹ رہی ہیں، ایک عورت سر پہ گھڑا اٹھائے پانی بھرنے جا رہی ہے۔ لاری کو دیکھ کر یونہی بلاوجہ ہنس پڑتی ہے۔ اس کے موتیوں سے سپید دانت بہت عرصہ تک آنکھوں میں، پھر تخیل میں لرزتے رہتے ہیں۔

جو سڑک ٹنگ مرگ سے گل مرگ کو جاتی ہے۔ وہ صرف تین میل لمبی ہے اس سڑک پہ انگریز مرد اور عورتیں عمدہ گھوڑوں پہ سوار نظر آتے ہیں ان کے

پیچھے پیچھے بھوری رنگت والے کشمیری ہانپتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں ٹوکری ہوتی ہے، کسی کے ہاتھ میں تھرماس، تو کسی کی گردن پہ کسی میم صاحب کا بچہ مرد تسمہ پا کی طرح سوار ہوتا ہے۔ مزدور اپنی کمر پہ ڈھائی من کا انبار اٹھائے جھکے ہوئے چڑھائی چڑھتے جاتے ہیں۔ وہ پنچایت والوں کے وہ مقولے نہیں پڑھ سکے جو ٹنگ مرگ میں آتشک اور سوزاک کی دوائیوں کی اشتہار کی طرح جا بجا لگے ہوئے ہیں۔ "مزدوری میں عزت ہے"۔ "مزدوری سے عار نہ کرو"۔ مزدوری کرنا سیکھو۔ اس سڑک کے دورویہ چیل اور دیودار کے تناور درخت ہیں۔ جن کے پاؤں میں سفید چھتریاں اور کھمبیں، اگی ہوئی ہیں، ننھے ننھے سے پھول ہیں۔ سرپٹی کا سبزہ اور کسی دیوار پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے ہیں اور سارا جنگل ان کی مدھم آواز سے گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس شہد میں جنگلی پھولوں کی حلاوت ہوتی ہے اور وہ مقوی وٹامن جسے تیار کرتے وقت ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا ہے۔

دو ننھے کشمیری لڑکے اس سڑک پہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ گل مرگ سے تھکے تھکے قدموں سے چل رہے ہیں۔ شاید گھر پہنچ کر ماں باپ بھی ناراض ہوں گے شاید کھانا نہ ملے صرف چانٹے ہی ملیں۔ سڑک کے نیچے بہت دور تک شور مچاتا ہوا فیروزپور نالہ بہہ رہا ہے، نیلا پانی جس میں سفید سفید جھاگ ملی ہوئی ہے نیلا جیسے ان کشمیری لڑکوں کی آنکھیں، سفید سفید جیسے لاری کی طرف دیکھتی نظر

کشمیرن کے دانت لیکن انڈے سے بھی نہیں بچے۔

دس بارہ کشمیری لڑکیاں پیالی نما ٹوکریوں سے جنگل سے لکڑیاں اٹھائے آرہی ہیں۔ ان بڑی بڑی ٹوکریوں میں وہ ٹنگ مرگ کے رہنے والے سیاحوں اور تپ دق کے مریضوں کے لئے لکڑیاں چن کر لا رہی ہیں۔ ان میں کئی لڑکیاں تپ دق کے مریضوں کی طرح کھانس رہی ہیں۔ کیونکہ لکڑیاں اٹھا کر جسم جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ ان لڑکیوں کی ٹانگیں بچپن ہی سے پھر کر بے ڈول ہو جاتی ہیں، چال میں ناہمواری رخساروں میں گڑھے، اور چھاتیوں میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں کبھی جوان نہیں ہوتیں، پہلے تو محض لڑکیاں ہوتی ہیں اور پھر ایک دم مائیں بن جاتی ہیں۔

جوانی کیا ہے؟ رس کیا ہے؟ جنگل میں شہد کی مکھی کس لئے پھولوں کی حلاوت جمع کرتی ہے۔ کنول کیوں مسکراتے ہیں۔ کمن پیالوں کی زرد زرد پتیاں، تھمے ہوئے پانی کیوں لرزتے رہتے ہیں۔ انھیں ان باتوں کی سمجھ نہیں۔

جو سڑک نو ہزار فٹ کی بلندی پر گل مرگ کے پیالہ کے گرد ایک زرکار فیتے کی طرح گھومتی جاتی ہے۔ اسے سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ یہاں سے سارے کشمیر کی وادی دکھائی دیتی ہے۔ سیکڑوں میل کا وسیع و عریض میدان چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ ابھی انسان پیدا نہ ہوا تھا۔ ان پہاڑوں نے ایک نیلی جھیل کو گھیر رکھا تھا۔ چاروں طرف برف کے گلیشر ہوں گے اور بیچ میں یہ جھیل۔ جس کے نشان

ابھی ڈل، ڈلر اور مانس بل کی جھیلوں میں ملتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اب بھی وہی پرانی جھیل ہے، وہی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں جو پر اسرار مافوق الفطرت منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر وہ جھیل کا پانی جیسے ایک دم کہیں غائب ہو جاتا ہے اور وادی کا سبزہ اور اس کے مرغزار اور اس کے گاؤں اور شہر آنکھوں کے آگے پھیلتے جاتے ہیں دیوداروں کا سناٹا، فیروز پور نالے کے شور سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے اور زندگی ہزاروں سال آگے کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اس سڑک پر میری ملاقات ایک آئرش لڑکی سے ہوتی ہے۔ نام ہے (Lira O Connor) لیرا او کانر۔ لیرا کی آنکھیں نہ نیلی ہیں، نہ بھوری نہ سبز۔ بلکہ ان تینوں سے ملتا جلتا ہوا کوئی اور رنگ۔ لیرا کی آنکھوں میں ایک عجب موہنی ہے۔ جیسے یہ آنکھیں ہمیشہ سپنے ہی دیکھا کرتی ہیں۔ لیرا کے بالوں کا رنگ پلاٹینم جیسا ہے، نازک، مہین، ریشمین ان کے گرد اس نے ایک نیلا رومال باندھ رکھا ہے۔ وہ آرام سے بیٹھی درمیانہ دیوداروں کے چھتنار کے سایہ میں اس گھاٹی کا اسکیچ بنا رہی ہے جہاں درختوں کی پھننگوں کا ایک جال سا بنا ہوا ہے اور جس کے آخر میں ندی کے پانی کی ایک لکیر کھنچ گئی ہے۔

"یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اپنی راہ دیکھو۔"

میں نے اطمینان سے کہا۔ یہاں سبز رنگ زیادہ گاڑھا ہے۔ پھر لوگ

تختے اور دیوداروں کے جال کا تناسب صحیح نہیں۔ خصوصاً یہاں تو ـــــ"

"بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ٹھیک کرتی ہوں ـــــــــ کیا تمھیں واٹر کلر کا شوق ہے؟"

مجھے واٹر کلر سے عشق ہے۔ یوں سمجھئے کہ ابھی عشق ہوا ہے؟"

لیرا اسکرائی اور پون گھنٹہ خاموش بیٹھی اسکیچ بناتی رہی۔

"مجھے بھوک لگی ہے اور میرے پاس یہ چند بسکٹ ہیں۔" لیرا نے ایک بسکٹ لبوں کے درمیان دبکتے ہوئے کہا۔

"لیکن" میں نے کہا۔ "میرے پاس یہ بھنا ہوا مرغ ہے اس تھرماس میں اور چند چپاتیاں بھی ہیں۔ اگر تمھیں ہندوستانی کھانے سے نفرت نہ ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو ـــــ"

وہ شوق سے کھانے لگی۔ پھر بولی "اس میں (CHILLIES) بہت زیادہ ہیں نہ جانے تم لوگ مرچیں اس قدر کیوں پسند کرتے ہو؟"

"یہ کھانے کا ذائقہ دوچند کر دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی جہاں اور ہر ایک حس مر چکی ہے وہاں ذائقہ کی حس ابھی برقرار ہے بلکہ متواتر فاقوں سے یہ حس اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ اس لئے سرخ مرچیں ـــــــ"

"نہ جانے تم لوگوں میں یہ کیا عادت ہے۔" اس نے اپنی پلاٹینی بالوں کو جھٹکا کر کہا۔ "جو کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات کرو وہ ہر پھر کر سیاست پر

آجائے گا۔ میں سرخ مرچوں کا ذکر کر رہی تھی تم اپنے وطن کی سیاست کا ذکر لے بیٹھے نہ جانے کیا بات ہے؟"

اس کے سرخ لب غصّہ سے خمیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "چلو سرخ مرچوں کے ذکر کو جانے دو۔ آؤ سرخ لبوں کا ذکر کریں۔ ان گلاب کے پھولوں کا جو تمھارے رخساروں پر کھلے ہوئے ہیں۔ ان چاندنی کرنوں کا جن سے تمھارے بال بنے ہیں۔ ان سپنوں کا جو تمھاری آنکھوں کی پتلیوں میں کانپ رہے ہیں جیسے کسی خاموش جھرنے کی سطح پر ترناری کے حیراں؛ دلرزاں پھول،

دوسرے دن شام کو گل مرگ کے بازار میں لیرا اولکانز گھوڑے پر سوار چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے مجھے لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب!

جو سڑک گل مرگ کی وادی کے بیچوں بیچ جاتی ہے۔ وہ گالف کورس کو درمیان میں قطع کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف انگریز، مرد اور عورتیں گالف کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اور کشمیری ہاتھوں میں گالف کے سامان کے جھولے اور چھڑیاں اٹھائے ان کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اس سڑک پر گل مرگ کا کلب ہے۔ اور آگے چل کر عین وسط میں ایک اونچی جگہ پر امپیریل بنک اور نیڈوز ہوٹل جاگیردارانہ نظام میں اور اس سے پہلے جو اہمیت دھرم سلہ

اور معبد خانے کو تھی، اس مہاجنی نظام میں وہی اہمیت ہوٹل اور بنک کو حاصل ہے۔ نئے نظام کے نئے مظہر بچارے البتہ وہی ہیں۔

اس سڑک پر انگریز اور انگریز نما ہندوستانی گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں کشمیری نوکر سرخ شلغم اور پیاز کے گٹھے اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں ۔۔۔ انڈوں کی ٹوکریاں، مٹن، مٹر اور پھل اٹھائے لے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ان کے کھانے کے لئے نہیں ہیں۔ صاحب لوگوں کے بچوں نے ہیٹ پہن رکھے ہیں۔ اور قیمتی اونی سوئٹر۔ میم صاحب لوگوں نے کارڈ مخمل کی بیش قیمت پتلونیں پہن رکھی ہیں جنھیں گل مرگ کے کشمیری درزیوں نے سیا ہے۔ لیکن یہ لوگ ان پتلونوں کو بھی نہیں پہن سکتے ہیں۔ یہ لوگ صرف مزدوری کر سکتے ہیں جیسا کہ پنچایت کا فرمان ہے۔ "مزدوری میں عزت ہے"۔ مزدوری میں عزت ہے" مزدوری میں عزت ہے" اسی سڑک پر ایک ہانتو بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوتے مرمت کرنے والا ہے۔ اور ایک گداگر۔ ہانتو پیلی پیلی پکی ہوئی ہاڑیوں کی ایک ٹوکری سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ یہ ہاڑیاں وہ اپنے کھیت کی مینڈ پر اُگے ہوئے ہاڑی کے درخت سے اتار کر لایا ہے۔ اس کھیت میں جو اناج تھا اسے زمیندار، بنئے اور حکومت نے رہن رکھ لیا ہے اور دو تین ہاڑیوں اور سیبوں کے درخت باقی رہ گئے ہیں وہ ان کا پھل گل مرگ لیجا کر بیچتا ہے تاکہ وہ صاحب لوگوں کو ہاڑی اور سیب کھلا کر اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ تھوڑے سے

سے چاول خرید سکے۔ گداگر آلتی پالتی مارے بیحیائی سے پیسہ مانگ رہا ہے جوتہ مرمت کرنے والا ایک ایسا جوتہ مرمت کر رہا ہے جس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہ ہوگی۔ خود اس کے اپنے پاؤں ننگے ہیں۔ تلوؤں میں بیایاں پھوٹ آئی ہیں اور ایک جگہ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ لیکن جوتوں کی تو خیر قیمت بھی ہوتی ہے بھلا اس خون کی کیا قیمت ہوگی۔

ایک بوڑھی انگریز عورت اپنی رنگین چھتری گھما گھما کر اپنے ساتھ چلنے والی دوسری عورت سے کہہ رہی ہے۔ مائی ڈیر تمھیں معلوم نہیں کہ جب وہ ہندوستانی ہمارے کمرے میں گھس آیا تو ہمیں کتنا ڈر معلوم ہوا۔ ڈر اور غصہ میں بھاگ کر دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنے خاوند کے پاس چلی گئی"۔

آج بہت دنوں کے بعد میں پھر اس سرکلر روڈ پر سیر کرنے کے لئے نکلا ہوں یہ جنگل بالکل خاموش ہے۔ کشمیر کی وادی پہ سورج غروب ہو رہا ہے اور بڑھتے ہوئے اندھیرے اور گھٹتی ہوئی روشنی کی ایک مسلسل شطرنج سی بنتی جا رہی ہے۔ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ اس وادی کی قسمت کیوں خاموش ہے۔ یہ جنگل اپنے بیٹے بیٹیوں کے لئے بھی نہیں بولتا۔ اس جنگل کا شہد اس کے اخروٹ؛ اس کے سیب، انڈے لکڑی، اس کا ریشم، اس کی ساری خوبصورتی و رعنائی، اس کی کوئی چیز بھی اپنے بیٹوں کے لئے نہیں، یہ کیسی خدائی ہے؟ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا "مزدوری نہ کرو" کارڈ مخمل کی پتلونیں پہنو، سیب کھاؤ، خوبانی

اخروٹ کھاؤ۔ مزدوری کرنے سے انکار کر دو، گھوڑے کی سواری کرو۔ دندناتے پھرو، یہ زمین تمہاری ہے۔ یہ آسمان تمہارا ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو آؤ اس ساری وادی کو ایک جھیل بنا دیں۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی جھیل جس میں ٹنگ مرگ اور گل مرگ سب سما جائیں۔ جس کے پانیوں میں انسانی بے رحمی کی جہنمی اور وحشی گھروندے سب فنا ہو جائیں، بس چاروں طرف وہی پرانی جھیل ہو، ہزاروں، لاکھوں، سالوں کی جھیل اور اس کے چاروں طرف بھی برف کے گلیشر اور برف سے لدے ہوئے پہاڑ کھڑے ہوں۔ تاکہ جب آسمان کی پہنائیوں سے سورج کی پہلی کرن جھیل کی سطح پر اترے تو مسرت سے چلا اٹھے۔

"شکر ہے ابھی انسان پیدا نہیں ہوا۔"

کرم چند اور کرم داد

یہ میرپور کا ذکر ہے۔ میرپور سے بیس کوس کے فاصلہ پر مولوی صاحب کا کوٹلہ ہے۔ اسے مولوی صاحب کا کوٹلہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں پر ایک بہت پرانا کنواں ہے۔ جو گرمیوں کے دنوں میں بھی خشک نہیں ہوتا جب تیز لو چلتی ہے اور آس پاس کے دیہات کے سارے کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں تو گیرو بھورے رنگ کی تپتی ہوئی پگڈنڈیوں پہ گھرے گندمی رنگ کی عورتیں نیلی قمیضیں اور کالی شلواریں پہنے ہوئے گھڑے اٹھائے اسی کنوئیں کا رخ کرتی ہیں۔ یہ کنواں بہت عرصہ ہوا ایک خدا پرست مولوی نے تعمیر کرایا تھا، جو جہلم کے اس پار سے آیا تھا۔ یہ کنواں بہت گہرا ہے اور اس کا پانی بہت میٹھا ہے۔ دوسرے کنوؤں کی طرح کھارا نہیں ہے۔ اس لئے یہاں پر عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے جو دور دور کے دیہات سے چل کر میٹھا پانی لینے کے لئے آتی ہیں۔

مولوی صاحب کے کوٹلے میں اس کنوئیں کے سوا اور کوئی چیز میٹھی نہیں ہے۔ جاڑے میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ گرمیوں میں تیز لو چلتی ہے کھیتوں

میں نکھد باجرے کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ دیہاتی بڑی کرڑی بولی میں
بات کرتے ہیں اور ہمیشہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے ہیں، گرمیوں میں اس لئے
نہیں نہاتے کہ پانی نہیں ملتا اور سردیوں میں اس لئے نہیں نہاتے کہ پانی ملتا ہے
مگر برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ کوٹلے کے چاروں طرف ٹنڈ منڈ ننگی
پہاڑیاں ہیں جن پر بیکڑ کی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ انہی جھاڑیوں سے
لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں۔ اس کے پھولوں سے تیز نکالتے ہیں اور اس کی
جڑوں کو کوٹ کے بخار، کھانسی، دمہ، تپ دق، نمونیا، جلاب، ناسور
گنٹھیا اور دوسرے تمام امراض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اکثر شفا پاتے ہیں
ان لوگوں کی صحت اس قدر اچھی ہے کہ یہ لوگ دور دور تک ڈکیتی اور چوری کے
لئے جاتے ہیں۔ کوٹلے میں ہر عورت جو بیاہی جاتی ہے۔ اغوا کر کے لائی جاتی
ہے۔ کوٹلا اور نواحی دیہات کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس کے ہاں کوئی آدمی قید
نہ رہ چکا ہو، یا پھانسی کی سزا نہ پا چکا ہو، ہر گھر میں ایک رائفل ضرور موجود
ہوگی کیونکہ ہر گھر کا جوان بیٹا فوج میں جا کے بھرتی ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب
کے کوٹلے میں کوئی مولوی نہیں رہتا ہے۔

بہت عرصہ گذرا، اسی مولوی صاحب کے کوٹلے کے دو نوجوان روزگار کی
تلاش میں گھر سے نکلے۔ ایک کا نام تھا کرم چند، دوسرے کا نام تھا کرم داد
دونوں بڑے تگڑے جوان تھے اور شکل و صورت سے ایک دوسرے کے

بھائی معلوم ہوتے تھے گو ان میں کوئی خاندانی رشتہ نہ تھا۔ ان دونوں نوجوانوں
کو گھر والوں سے تین تین روٹیاں ملیں اور پسا ہوا نمک اور ایک ایک پیاز کی بڑی
گٹھی۔ لاٹھیاں لیں اور روٹیاں پوٹلی میں باندھ کر کرم چند اور کرم داد اپنے اپنے
گھر سے نکلے اور مولوی صاحب کے کنوئیں پر مل گئے۔

تھمب گاؤں کے نمبردار کی بیٹی جو کنوئیں پہ پانی بھرنے کے لئے آئی تھی ان
دونوں کو دیکھ کر ہنسی اور لال چھینٹ کی ڈوپٹہ کی اوٹ سے ہنستی رہی کرم چند اس
کے کنوارے سینے کے زیر و بم کو بڑی حسرت سے دیکھتا رہا۔ پھر جرأت کر کے بڑی
لجاجت سے بولا۔ اے تھمب کے نمبردار کے گھر کی چاندنی، تیری ماں کا لاجیے
لے جائے۔ فقیر پردیس جاتے ہیں۔ ایک گھونٹ پانی پلا دے اپنے کنوئیں کا۔

کرم چند نے کرم داد کے سر پر دھپ جما کر کہا، اے بے گالی بکتا ہے
نمک چرے کے تخم بے پیر، پھر کرم داد نے اپنی پگڑی کے طرّے کو استوار کیا
اور شوخ نگاہوں سے تھمب کے نمبردار کی حسین بیٹی کو دیکھ کر بولا۔ دیس نکالا
بے بول چاندی کی مورتی، اپنے کنگن ایسے خوبصورت ہاتھوں سے گھڑے کو جھکا
کر پانی پلا دے۔ کرم داد تجھ پر مولوی صاحب کا سارا کوٹلہ قربان کر دے۔
(سوائے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے) سوا حرامزادے نمک چرے کے تخم
بے پیر کرم چند کے،

تھمب کے نمبردار کی بیٹی ہنستے ہنستے دہری ہوگئی کرم چند بڑی حسرت سے نیلی

سوہنی کی قمیص پر ابھرتی اور گرتی ہوئی ہنسی کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ نمبردار کی بیٹی نے اپنا گھڑا جھکایا کرم چند اور کرم داد دونوں نے اپنی اوک بڑھائی نمبردار کی بیٹی نے اس طرح اپنا گھڑا اچھلکا دیا کہ دونوں اوکیں بھرتی گئیں اور وہ دونوں پیتے گئے، اور کانچ کی چوڑیوں کے چھناکے سنتے گئے اور سرخ رخساروں پر گری ہوئی پلکوں کو دیکھتے گئے۔ حتیٰ کہ رخساروں پر ننھی ننھی شبنمی بوندیں ابھر آئیں۔ اور پھر گھڑے کا پانی ختم ہو گیا۔ اور پیچھے سے آ کے ان کے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی حسنا نے انھیں دھپ جمائی اور کہا مردود اب جاؤ بھی، بہت پریشان کر لیا تم نے ہم کو۔

کرم چند اور کرم داد دونوں آہستہ آہستہ اٹھے، اپنی لاٹھیاں سنبھالیں۔ جگت پر کھڑی لڑکیوں کو سلام کیا۔ اپنے گاؤں کو اس کے آس پاس کے پہاڑوں کو سلام کیا اور منہ موڑ کر میرپور کے رستے پر ہو لیے، لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ ہولے ہولے گانے لگیں۔

"ٹر چلیوں پردیس
رانجھنا! رانجھنا!!"

کچے رستے کے موڑ تک وہ دونوں رانجھنا رانجھنا کے نغمے کو اپنے ساتھ چلتا ہوا محسوس کرتے رہے۔ موڑ پر یک لخت وہ نغمہ رک گیا۔ انھوں نے گھوم کر دیکھا وہ گاؤں، وہ کنواں، وہ پہاڑیاں، وہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے جن پر وہ چاندنی راتوں

میں کھیلا کرتے تھے، بچپن میں آنکھ مچولی، جوانی میں کبڈی۔ وہ سب نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ موڑ مڑتے ہی جیسے ہر پرانی شے، ہر جانی پہچانی عزیز ترین شے ان سے کٹ کر الگ ہو گئی اور اب وہ ایک نئے رستے پر اک نئے شہر کو ایک نئے دیس میں ایک نیا روزگار ڈھونڈنے جا رہے تھے۔

کرم چند اور کرم داد نے اپنے اونچے رستے سے نیچے کی پھیلتی ہوئی پہاڑیوں کے سلسلے کو دیکھا۔ جن کے آخر میں جہلم کا کنارہ ایک چاندی کی گوٹ کی طرح چمک رہا تھا۔ کرم داد نے کہا "دن ڈھلنے سے پہلے ہم میرپور پہنچ جائیں گے۔" کرم چند نے کہا "جلدی چلو۔ رکنے سے میرے پاؤں بار بار لوٹ جانے کو کہتے ہیں۔

کرم داد مسکرایا۔ بڑے میٹھے جذباتی انداز میں بولا۔ "مقتب کے نمبردار کی بیٹی کی یاد تو نہیں آ رہی۔ لفٹین بہادر خاں کہتا تھا۔ میں دیس دیس گھوما ہوں۔ سمندر پار سات ولایت بھی دیکھ آیا ہوں۔ ایمان سے اپنے گاؤں ایسی خوبصورت لڑکیاں کہیں نہیں دیکھیں۔

کرم چند نے جلدی سے کہا۔ آگے بڑھو۔ ورنہ مجھے تمھیں اٹھا کے لے چلنا پڑے گا۔"

"دیکھیں کون تیز چلتا ہے۔" کرم داد نے چیلنج کیا دونوں تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ ساتھ ساتھ۔ برابر برابر۔ جہاں ہموار راستہ ہوتا وہاں دونوں ساتھ ساتھ رہتے۔ جہاں ڈھلان یا چڑھائی آ جاتی وہاں کبھی ایک آگے ہو جاتا کبھی دوسرا

کبھی ایک گیت گانے لگتا کبھی دوسرا۔ اسی طرح چلتے چلتے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو گیت سناتے ہوئے وہ بہت سا راستہ طے کر گئے۔

صبح سے دوپہر ہو گئی اور دوپہر بھی جانے لگی تو وہ بیریوں والی ڈھکی کے نیچے پہنچ گئے یہاں سلیٹی رنگ کی بڑی بڑی چٹانیں تھیں جن کے دامن میں ایک صاف ستھرا ٹھنڈا چشمہ تھا۔ چٹانوں کے اوپر بیری کا ایک بہت بڑا جھاڑ پھیلا ہوا تھا۔ اور چٹانوں کے سائے اور جھاڑ کے سائے سے یہ جگہ مسافروں کو بہت خوشگوار اور ٹھنڈی معلوم ہوتی تھی۔

وہ دونوں چشمے کے کنارے لیٹ گئے اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگے پانی پی کے اٹھ بیٹھے اور پوٹلیاں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ بیچ بیچ میں جب زبان کا لعاب بھی باجرے کی روٹی کو حلق سے اتارنے میں ناکام رہتا تو بڑھ کر چشمے سے ایک گھونٹ پانی پی لیتے اور پھر روٹی کھانے میں مصروف ہو جاتے۔ کرم داد نے پوچھا۔ تم میرپور جا کر کیا کرو گے۔ کیا ارادہ ہے؟

کرم چند نے کہا۔ ”وہی کروں گا جو میرا باپ کرتا آیا ہے۔ یعنی نمک کا بیوپار“۔

کرم داد نے کہا ”نمک چور کے تخم بے پیر، بیوپار کے لئے تمہارے پاس پیسہ کہاں ہے؟

کرم چند نے کہا۔ ”ہاں پیسہ تو نہیں ہے، سوچ رہا ہوں کسی آڑھت کی

دوکان پر نوکری کر لوں گا پھر آہستہ آہستہ کچھ ہو جائے گا اور تم کیا کرو گے؟

کرم داد نے کہا۔ ”کیا کروں، آج کل بھرتی بند ہے ورنہ سب کچھ ہو جاتا، اچھا میرپور آنے دو اللہ خود اسباب پیدا کر دے گا۔“

کرم چند نے کہا تم بھی میرے ساتھ آڑھت کی دوکان پر نوکر ہو جانا۔

کرم داد نے کہا۔ نہیں یہ جھک جھک مجھ سے نہیں ہوتی۔ یہ بازاروں گلیوں چھوٹی چھوٹی دوکانوں تنگ جگہوں کی نوکری مجھ سے نہیں ہوگی کرم چند، میں تو کوئی کھلا کام چاہتا ہوں۔ جس میں خوب ہات پاؤں پھیلا سکوں، کیا کریں اپنے دیس میں اناج ہی نہیں ہوتا۔ ورنہ وہیں کھیتی باڑی کرتا۔ ادھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

کھانا کھا کے وہ دونوں ذرا ایک ”پلک“ جھپکنے کے لئے سو گئے اور ایسے سوئے کہ جب اٹھے تو سورج بڑی تیزی سے مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے اٹھے اور گالیاں دیتے ہنستے گاتے ایک دوسرے سے تیز چلنے بلکہ اب تو دوڑنے کا مقابلہ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے۔ اب کے مقابلہ ان کا آپس کا نہ تھا بلکہ ڈھلتے ہوئے سورج سے تھا۔ کوئی دو میل تک وہ دونوں دوڑتے ہوئے گئے۔ پھر تھوڑا سا دم لے کے آگے بڑھے۔ اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ جب دوڑنے سے تھک گئے تو تیز تیز چلنے گئے اور جب سورج مغرب میں پہنچ گیا تو وہ میرپور سے چار کوس کے فاصلہ پر چھوٹی مسجد کے قریب پہنچ گئے تھے۔ چھوٹی مسجد کے تالاب میں مسجد کے منارے اور گنبد آویزاں تھے اور ان کے پیچھے سورج کی روشنی گم ہو رہی تھی شام کی خنک ہوا چلنے لگی تھی اور کچے تالاب

کے کنارے بیریوں کے جھاڑ میں واپس آتی ہوئی چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ تالاب کے سامنے والے گھر سے دھواں بلند ہونا شروع ہو گیا تھا اور ایک بچہ اپنے تتلاتے ہوئے لہجے میں اپنی اچھی امی سے روٹی کا ٹکڑا مانگ رہا تھا۔ ایک لڑکی تالاب پہ پانی پینے آئی اور وہ دونوں اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ اس کے الجھے الجھے بالوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں جھلملا رہی تھیں اور اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں ایک سحر طراز روشنی، ٹھنڈی خنک روشنی سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ ان کے اپنے گاؤں میں بھی کوئی لڑکی اتنی خوبصورت نہ تھی۔

کرم داد پہلے بولا "تیرا باپ زندہ ہے؟"

لڑکی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف تکتے ہوئے کہا "ہاں"

"تیری ماں"

"ہاں"۔

"تیرا گھر سامنے ہے؟!"

"ہاں"

"تیرے گھر میں لسی ہے؟"

"ہاں" مگر تم ——"

بس زیادہ کچھ نہ کہہ ہم سے ہمیں اپنے گھر لے چل"

ہم تیرے گھر چل کر تیرے ہاتھ سے لسی پئیں گے اور بس پھر فقیر چلے جائیں گے جلدی کر منزل کھوٹی ہو رہی ہے"

لڑکی کے گھر جا کر ان دونوں نے پیٹ بھر کے لسی پی۔ چھوٹا لڑکا جو امی سے روٹی کا ٹکڑا مانگ رہا تھا کرم داد کی گود میں آ بیٹھا، کرم داد نے اسے روٹی کا ٹکڑا دیا اور اس سے پوچھا "تیرا نام کیا ہے؟"

"اللہ داد"

"تیرے باپ کا نام"

"مراد"

"تیری امی ہے؟"

"ہاں"

"وہ تیری بہن ہے؟

ہاں"

"تیری بہن کا کیا نام ہے؟"

"بالی"۔

بالی سے کہہ "ہمارے گھر آج ایک مہمان آیا ہے۔ وہ آج رات کو کھانا کھا کر سیر ہو جائے گا

اللہ داد کی امی نے پوچھا، کہاں سے آئے ہو جوان؟"

"مولوی صاحب کے کوٹلے سے"۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

کرم داد نے کہا: "میں تو نہیں رہ رہا ہوں میرا دوست میرپور جا رہا ہے

کرم چند نے بہت سمجھایا، لیکن کرم داد نہیں مانا، ناچار کرم چند اکیلا میرپور چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے آڑھت کی دوکان پر نوکری کر لی وہ آڑھتی کے نیم کے گھر کا سارا کام کرتا تھا اور آڑھت کی دوکان پر سامان بھی ڈھوتا تھا اور جب اسے فرصت ملتی تو منڈے پڑھنے بیٹھ جاتا۔ بغیر منڈے پڑھے وہ آڑھت کا کام کیسے جان سکتا تھا۔ اسی دن رات کی محنت میں اس نے تین سال بتا دیئے اب وہ بڑے نیم کا چھوٹا نیم ہو گیا تھا۔ اور چھوٹی موٹی قسم کی چار سو بیس خود کرنے لگا تھا، اب وہ ہر روز نہاتا تھا، ریشمی بنیائن، ململ کا کرتا، اور لٹھے کا پاجامہ پہنتا، اس کا بدن پہلے کی طرح کھردرا نہ تھا۔ ہر روز ملائم ہوتا جا رہا تھا۔ ان دو سالوں میں ایک بار بھی اپنے دوست کرم داد سے ملنے نہ جا سکا نہ کرم داد اس سے ملنے آیا، دو سال کے بعد ایک روز اسے چھوٹی مسجد کے گاؤں میں آڑھت کے سلسلے میں جانا پڑا۔ جانا تو اصل میں بڑے نیم کو تھا۔ لیکن چونکہ اس کام میں کوئی بہت بڑے نفع کی امید نہ تھی اس لئے بڑے نیم نے کرم چند کو بھیج دیا۔

کرم چند بہت سویرے ہی چھوٹی مسجد کے تالاب پر پہنچ گیا۔ تالاب کے سامنے گھر تھا اور گھر کے دروازے کا عکس پانی پر پڑتا تھا۔ کرم چند نے دیکھا کہ پانی کی سطح پر ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لڑکی گھڑا لئے نمودار ہوئی اور دروازہ پر ایک لمحہ کے لئے رکی۔ دوسرے لمحے میں ایک اور آدمی پیچھے سے آیا۔ اس کے کندھے پر ہل تھا دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے ملیں اور پھر فوراً پیچھے سے دو بیل آئے اور ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور جوان آدمی جو کرم داد تھا۔ ادھیڑ عمر کے آدمی کے ساتھ کھیتوں میں چلا گیا اور لڑکی گھڑا اٹھائے آپ ہی آپ مسکراتی تالاب کے کنارے کنارے ہولے ہولے ایک عجب چال سے چلتی ہوئی بلکہ جھومتی ہوئی کرم چند کے قریب آ گئی۔ جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے میں محبت کی لہریں مچل رہی ہوں اور ساحل سے ٹکرانے کے لئے بیتاب ہوں۔

کرم چند نے پوچھا۔ "کرم داد کہاں ہے؟"

لڑکی پانی بھرتے بھرتے یکایک ٹھٹھک گئی۔ پھر اس نے کرم چند کو پہچان لیا۔ بولی "کھیتوں میں گیا ہے مہاجنی کے لئے!"

"تمہارے ہاں کام کرتا ہے؟"

"ہاں" لڑکی نے مسرت سے سر ہلایا۔

"کیا تنخواہ ملتی ہے!"

"روٹی کا ٹکڑا ملتا ہے اور کیا ملے گا اسے؟"

"تمھاری اس سے شادی نہیں ہوئی!"

"لڑکی نے سر جھکالیا" کچھ نہیں بولی۔

"کیوں نہیں ہوئی؟"

وہ آہستہ آہستہ بولی۔ "ابا نہیں مانتے" پھر اس نے آہستہ سے گھڑا اٹھایا اور منہ پھیر کر کہنے لگی۔ گھر آکر لسی پی جاؤ۔ کرم داد تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔"

کرم چند نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں بالی، میں اس وقت نہیں آؤں گا۔ تم کرم داد سے کہہ دینا اس کا دوست دولت چند لکشمی چند مہاجن کے یہاں چھوٹا منیم ہے۔ اس کی حالت بہت اچھی ہے۔ وہ اپنے دوست کرم داد کو بہت یاد کرتا ہے۔ کرم داد اگر کرم چند کے پاس آجائے تو اسے کوئی تکلیف نہ رہے گی۔

"میں کہہ دوں گی۔"

بالی چلی گئی۔ کرم چند دیر تک اس کے خوبصورت جسم کو دیکھتا رہا۔ جب وہ چلی گئی، نظروں سے اوجھل ہوگئی جب بھی وہ بہت دیر تک اس کے خوبصورت جسم کو دیکھتا رہا۔

تین سال اور گذر گئے۔ اور کرم چند نے آڑھتی کا اتنا اعتماد حاصل کرلیا تھا کہ اس نے روز روز کی شکایتوں کے دباؤ سے بڑے منیم کو آڑھت کی دوکان سے نکلوا دیا۔ اب وہ آڑھتی کا دست راست تھا اور اس کا سارا کاروبار بڑی حسن و خوبی سے سنبھالتا جا رہا تھا۔ اور اسی حسن و خوبی سے اپنی آمدنی الگ

بڑھاتا جا رہا تھا کیونکہ وہ خود آڑھت کی دوکان کھولنا چاہتا تھا اور دولت رام لکشمی چند کے مقابلے پر میرپور میں ایک عالی شان حویلی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ تین سال اور گزر گئے اور اس نے بڑے مندے کے خطرناک دنوں میں وہ چال چلی کہ دولت رام لکشمی چند کا سارا کاروبار چوپٹ ہوگیا اور اسے دیوالیہ نکالنا پڑا۔ اب تو مجبوراً کرم چند کو اپنے مالک کی دوکان سے الگ ہونا پڑا۔ اس نے بازار میں نکڑ پر جدھر سے سڑک جاتی تھی ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی۔ اس میں یہ فائدہ تھا کہ دیہاتی جو فصلوں کا اناج بیچنے کے لئے آتے۔ سب سے پہلے اسی کے یہاں آتے۔ تھوڑے دنوں میں کرم چند کی دوکان چمک اٹھی، اور اس کا کاروبار میرپور کے آس پاس کے گاؤں میں پھیلنے لگا۔ اور اب کے چھ سال کے بعد پھر اسے اپنے کام سے چھوٹی مسجد کے گاؤں کو جانا پڑا۔

اب کے وہ پیدل نہیں تھا۔ ایک عمدہ خچر پر سوار تھا اور اس کے ساتھ اس کا ملازم تھا۔ اب وہ تالاب کے کنارے اجنبیوں کی طرح نہیں ٹھہرا بلکہ سیدھا تالاب کے کنارے اس پار کے گھر کی طرف خچر بڑھائے گیا۔ اور دندناتا ہوا آنگن کے اندر چلا گیا۔

چولھے کے قریب بالی کی ماں روٹی پکا رہی تھی۔ آنگن میں بچھی ہوئی ایک کھاٹ پر بالی اور کرم داد دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے۔ مکئی کی روٹی اور باتھو کا ساگ۔ تھوڑا سا مکھن اور لسی کا چھنا۔ کرم داد اسے دیکھتے ہی

اٹھ کھڑا ہوا اور زور سے بولا۔ "ابے نمک چور کے تخم بے پیر" دونوں دوست
بڑے تپاک سے ملے اور جب کرم داد نے کرم چند کو چھاتی سے لگا کر زور سے
بھینچا تو اسے معلوم ہوا کہ کرم چند کا جسم تو بالکل ہی نرم پڑ گیا ہے۔ عورت کی جسم
کی طرح اور اس کا پیٹ بھی تھوڑا سا آگے کو بڑھ آیا ہے۔

کرم داد نے اس کا پیٹ بجا کے پوچھا۔ "کتنے مہینے کا ہے ڈھولکی کے؟"

کرم چند ہنسنے لگا۔ کرم داد نے اسے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا
اور وہ تینوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھانے لگے۔ کرم چند کو اب یہ کھانا سوکھا
سوکھا سا لگ رہا تھا اور اسے لسّی کے چھینٹے سے بھی بو سی آ رہی تھی۔ اس نے
بالی کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ خوبصورتی کے ان چھوٹے چھوٹے
ٹکڑوں کو پھر سے جوڑ رہا ہے، جو اس نے اپنی زندگی میں کبھی یہاں کبھی وہاں
دیکھے تھے، لیکن کبھی ایک جگہ نہ دیکھے تھے۔ صبح کے جھلملاتے ہوئے خنک
روشنی والے تارے، جیسے اوس میں بھیگے ہوئے گلابی پھول، جیسے ہوا
میں کانپتے ہوئے آم کے نئے پتے۔ جیسے گہری رات میں ندی کی سطح پر چھن کر
آنے والی شرمیلی چاندنی، جیسے اچانک بارش سے بھیگ جانے والی دھرتی
کی سوندھی سوندھی خوشبو، جیسے دوپہر کے سناٹے میں کسی مہجور گیت کی گم ہوتی
ہوئی لے۔ جیسے نمک کے بڑے ڈبے میں گلے سڑے اناج کی بوریاں، غلیظ
گندے گڑ کی بھیلیاں ہیں جو وہ اپنے گودام میں گلا سڑا کر رکھتا تھا تاکہ بھاؤ

پر وہ اسے زیادہ داموں سے بیچ سکے۔ یکایک کرم چند کو ایک اہم انداز میں
محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کی غلاظت چھٹ رہی ہے اور نور کی ایک ہانپتی
کانپتی سی کرن اس کے تاریک سینے کی چٹان کو توڑ کر اندر آنے کا جتن کر رہی
ہے۔

کرم چند نے کہا۔ "شادی کب ہوئی؟"

کرم داد نے کہا "دو سال ہو گئے۔ اب تو ننھا بھی ہے۔

بالی کھاٹ سے اٹھ گئی اور ننھے کو لے آئی۔ ننھا کرم چند کی گود میں ہمکنے لگا

کرم چند نے کہا۔ "تم لوگ شہر میں آ کر رہو، میں ایک بہت بڑی حویلی بنوا رہا
ہوں۔ سچ کہتا ہوں، کرم داد تم لوگ میرے ہاں آ کر رہو۔ اب تمہیں محنت
مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرم داد۔ دن رات کھیتوں میں
سڑتے ہو۔ دیکھو تو بالی کے پاس اچھے کپڑے بھی نہیں ہیں۔

کرم داد نے کہا۔ "میں تو اپنے کھیتوں کے بغیر مر جاؤں گا، جانے تو
کیسے دن بھر اس کالی دکان میں رہتا ہو گا، نمک چور کے تخم بے پیر چھوڑ دے
سب کھڑاک، میرے گھر آ جا، یہاں تجھے مکھن اور لسی کھلاؤں گا اور کھیتوں
میں کام کراؤں گا۔ مگر تو اب کام کیسے کرے گا۔ پہلے اپنے اس بڑے پیٹ
کا بچہ تو جن لے۔

کرم داد ہنسنے لگا۔ بالی بھی ہنسنے لگی۔ کرم چند بھی خفیف ہو کر کھسیانی ہنسی

بنسے لگا۔"

دس سال اور گذر گئے اور اب کرم چند نے شہر میں ایک عالیشان حویلی تعمیر کرالی تھی اور اس کی بوسکی کی قمیض میں سونے کے بٹن ٹکے ہوئے تھے اور اب وہ میرپور کے آدھے بازار کا مالک تھا اور کئی گلی محلوں میں اس کے مکان تھے اور راج دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اب کے سرکار نے جو میرپور میں موٹر کی سڑک بنانے کا فیصلہ کیا تو اس کا ٹھیکہ بھی کرم چند ہی کو ملا۔ یہ سڑک جو گاؤں بالیاں سے میرپور اور میرپور سے کوٹلی تک جاتی ہے اور راستے میں چھوٹی مسجد کو مولوی صاحب کے کوٹلے سے ملا دیتی ہے اس ٹھیکے سے کرم چند نے لاکھوں روپیہ کمایا، بلکہ یوں کہئے کہ لاکھوں روپیہ کاٹا اور وہ اب جنگلوں کے ٹھیکے لینے لگا اور لکڑی دریا کے جہلم کے ذریعہ شہر جہلم کے بڑے کاٹھ گودام تک بھیجنے لگا، اس نے جہلم میں بھی اپنی آڑھت کی دوکان کھول لی۔ تین موٹریں رکھ لیں اور میرپور میں ایک گوردوارہ اور ایک مندر اور ایک پاٹھ شالا تعمیر کی۔ اب اس نے پڑھنا لکھنا بھی خاصہ سیکھ لیا تھا اور اب وہ ہمیشہ اپنے دستخط یوں کیا کرتا تھا۔

لالہ کرم چند آڑھتی رئیس اعظم میرپور

جن دنوں موٹر روڈ میرپور سے چھوٹی مسجد تک پہنچی تھی وہ ایک روز دیکھ بھال کے لئے چھوٹی مسجد گیا تھا۔ اس روز وہ پیدل نہیں گیا تھا۔ خچر پر بھی

سوار نہ تھا۔ وہ اپنی موٹر میں خود بیٹھ کے اسے خود چلا کے چھوٹی مسجد گیا تھا۔ یہاں وہ دن بھر اپنے کام میں اس قدر مصروف رہا، انجینئروں اور اوورسیروں سے صلاح مشورہ کرتا رہا مزدوروں اور خلاصیوں کے جھگڑے نبٹاتا رہا اور اسی مصروفیت کے عالم میں اسے کرم داد سے ملنا بھی نہ یاد رہا۔ حالانکہ کرم داد کا گھر تالاب کے کنارے واقع تھا اور تالاب کے کنارے ہی سے موٹر روڈ گزرتی تھی اور تالاب کے کنارے انجینئروں اور اوورسیروں کے تنبو لگے ہوئے تھے اور گو وہ کرم داد سے نہ مل سکا لیکن کرم داد نے اسے دور ہی سے اپنے کھیتوں میں سے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھ کر وہ وہیں سے چلا اٹھا تھا، اے ڈھولکی کے نمک چور کے تخم بے پیر، لیکن اس کی آواز کرم چند تک نہ پہنچی تھی اور اس نے ادھر کوئی دھیان نہ دیا تھا اور اس کے بعد بھی کرم داد نے کرم چند سے ملنے کی بڑی کوشش کی، لیکن انجینئر لوگ اور دوسرے بڑے بڑے آدمی سیٹھ کی موٹر کو اس طرح گھیرے ہوئے تھے۔ وہ موٹریں یہاں سے وہاں اڑتی تھی کہ کرم داد کسی طرح بھی ہزار کوشش کرنے کے باوجود اپنے دوست کرم چند سے نہ مل سکا اور کرم چند اپنے دوست کرم داد سے ملے بغیر واپس میرپور چلا گیا اور واپس میرپور پہنچ کر بھی اسے خیال نہ آیا کہ چھوٹی مسجد میں کرم داد بھی رہتا ہے جب سے وہ آج مل کے نہیں آیا ہے آج اس کی زندگی میں کوئی عجیب بات نہیں ہوئی تھی لیکن کرم داد کو چھوٹی مسجد میں یہ بات بہت عجیب اور ناگوار سی معلوم ہوئی اور وہ بہت دیر تک اسے نہیں بھول سکا۔

یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتے بجتے بند ہو گئی کرم چند نے کوشش کی ——ہلو۔

—— ہلو —— خاموشی۔ کرم چند نے گھبرا کر بتی جگائی ۔ آج بتی بھی نہیں جگی، چاروں طرف سناٹا تھا، ایسی خاموشی جیسے اب کہیں کچھ نہ ہوگا، پھر کہیں سے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ کوئی تیز تیز قدموں سے اس کی طرف بھاگا بھاگا آیا۔ کہنے لگا۔

حملہ آور آن پہنچے۔ شہر پر حملہ بول رہے ہیں ۔

کہاں پر ہیں؟" کرم چند نے گھبرا کر کہا ۔

" نیچے ڈھکی کے نیچے پہنچے ہیں

" کتنے آدمی ہیں

کوئی دو ہزار ہوں گے " اگر جان بچانی ہے تو بھاگو،

کرم چند پولس چوکی میں بیٹھا تھا۔ یہاں پر صورت حال کے متعلق پوچھ گچھ کرنے آیا تھا۔ وہ اس وقت صرف ایک قمیص اور پاجامہ پہنے تھا۔ اسے یکایک اپنی ہری بھری دوکان کا خیال آیا۔ میر پور کے محلوں اور بازاروں میں پھیلے ہوئے مکانوں اور دوکانوں کا خیال آیا اور پھر آخر میں اسے اپنی تجوری کا خیال آیا جس کے اندر سونے کی اینٹیں تھیں پولیس چوکی میں صرف ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ کرم چند نے

اس سے پوچھا

"اب کیا ہوگا"۔

سپاہی نے کہا۔ "اب کیا ہو سکتا ہے" ہم لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔

کرم چند پولس چوکی سے باہر بھاگا۔ باہر آتے ہی اس نے دیکھا۔ سب لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کرم چند بھی بھاگا۔ پہلے وہ جہلم جانے کے لئے مغرب کی طرف بھاگا لیکن ادھر سے حملہ آور آ رہے تھے۔ پھر وہ کوٹلی جانے کے لئے مشرق کی طرف بھاگا۔ لیکن کوٹلی بھی حملہ آوروں کے قبضے میں تھی۔ ٹیلے پر شہر آباد تھا اور نیچے کھیت پھیلے ہوئے اور سامنے جلی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ کرم چند بھاگتا بھاگتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

آدھی رات کے قریب کرم چند کھیتوں میں سے ہوتا ہوا سوکھے نالیوں سے چلتا ہوا ویرانیوں سے گذرتا ہوا چھوٹی مسجد کے تالاب کے پاس پہنچ گیا۔ راستے میں اسے دور سے گریوں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی رہی اور آدمیوں کی چیخیں اور کراہنے کی آوازیں اور لاریوں کا شور سڑک پر بڑھتا گیا اور پھر میر پور کے ٹیلے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے گئے اور پھر سارا مغربی آسمان سرخ سرخ روشنی سے ابلنے لگا۔ تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے اسے تالاب کے پانی میں مغربی آسمان کی سرخ روشنی منعکس نظر آئی اور اس کے پس منظر میں مسجد کے مینارے اور کنگرے نمایاں ہوتے گئے اور کرم چند نے سوچا کہ اس کا مکان جل گیا ہے۔ اس کی دوکان لٹ گئی ہے اس کی حویلی برباد ہو گئی ہے، اس کی تجوری کھول ڈالی گئی ہے اور اب اس کے پاس

ان دو کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے جنہیں پہن کر وہ میرپور آیا تھا اور شاید وہ اپنی جان بچا کر بھی یہاں سے نہیں لیجا سکے گا۔

کرم چند آہستہ سے اٹھا اور کرم داد کے گھر پہ دستک دینے لگا بہت دیر کے بعد وہ دروازہ کھلا اور وہ بھی ذرا سا دروازہ کھلا اور کوئی دروازے کے پیچھے سے بولا

کون ہے؟"

کرم چند نے آواز پہچان لی۔ کانپتے ہوئے سرگوشی میں بولا

"دروازہ کھولو کرم داد۔ میں ہوں تمہارا دوست کرم چند۔

کرم داد نے سارا دروازہ زور سے کھول دیا اور کرم چند کے گلے سے لپٹ کر بولا "اپنے نمک چور کے بیٹے تخم بے بیر، آخر آگیا نا ٹھکانے پہ۔ دیکھ بالی کون آیا ہے اٹھ بالی دیکھ کون آیا ہے۔ میرا دوست کرم چند آیا ہے۔ دیکھ! میں نے کہا تھا ایک روز کرم چند ٹھکانے پر آجائیگا وہ ہزار ہا بے ایمان ہو جائے وہ پھر ٹھکانے پہ آجائیگا وہ میرا دوست ہے۔

کرم چند نے کہا "آہستہ بولو کوئی میرا نام سن لیگا تو میں جان سے مار ڈالا جاؤنگا"

کرم داد نے کہا کون ڈھونگی کا تجھے میرے جیتے جی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اٹھ بالی روٹی پکا جلدی سے روٹی تیار کر دے۔

بالی نے مسکرا کر کہا "آج میں نے ایک آدمی کا کھانا الگ رکھ دیا تھا میرا دل کہتا تھا آج کا دن ایسا ہے کسی نہ کسی کو یہاں آنا ہی چاہیے۔" کرم داد نے خوش ہو کر بالی کو

چپاتی سے لگا لیا۔

بالی نے روٹی سامنے رکھ دی۔ کرم چند کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہی سادہ سا کھانا تھا، باجرے کی روٹی۔ تھوڑا سا گھی، ہرا سا ساگ، اور لسی کا بھرپور چھنا۔

صبح اٹھتے ہی کرم چند نے اپنے سونے کے بٹن قمیض سے اتار کر الگ کر دئے اور انھیں کرم داد کو دیتے ہوئے کہنے لگا۔ اب میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انھیں لیلے اور مجھے کسی طرح جموں پہنچا دے۔

کرم داد نے اس کے سر پہ دھپ جمائی اور بٹن اٹھا کر باہر کھیتوں میں پھینک دیا بولا "میرے کھیت سونا اگلتے ہیں تو مجھے یہ کھوٹا سونا کیا دیگا۔ اٹھا ہل اور چل کھیت میں کام کر بہت تھک چکا۔ اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گا۔

کرم چند اور کرم داد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں دیر تک ایکدوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کرم چند نے آہستہ سے ہل اٹھا کر اپنے کندھے پہ رکھ لیا، کرم داد نے مسکرا کر بیلوں کی جوڑی سنبھالی اور دونوں ساتھ ساتھ گھر کے آنگن سے باہر نکل گئے۔

بالی انھیں یوں جاتے دیکھ کر اونچی آواز میں گانے لگی۔

"ڈیل بیرا"

"یس سر"

"کیا بات ہے"

"سب ٹھیک ہے، ٹنگ مرگ سے نیا مس صاحب آیا ہے۔ لیکن صاحب اس صبح چار بجے ٹنگ مرگ میں منیجر صاحب کے بنگلے پر حاضر ہونا مانگتا"

"اوہ سب ٹھیک ہے ام کھود سنا تم نے، ام کھود پہنچا ے گا"

ایک انداز یہ ہوتا۔

"ہیلو ڈارلنگ" وہ کہتا

"ہیلو سوائن" (سور کے بچے) نرس کہتی

"کم آن"

"یو سٹوپڈ" (تم احمق ہو)

"ڈونٹ بی سلی" (جاہل نہ بنو) "کم آن" اب آبھی جاؤ"

"YOU are very cheeky"

"Shut up"

اس خوبصورت اور حسین تعارف کے بعد دونوں دیودار کے جنگلوں میں نفشے کے پھول جمع کرنے کے لئے تشریف لے جاتے۔

ادبرائن ان خاقہ مستوں کو معاف کر دیتا تھا یہ بیچارے چند دنوں کے لئے چھٹی

پر آئے تھے۔ اس کے بعد پھر جنگ پر چلے جائیں گے۔ یہ فوجی ان چند دنوں میں اپنی جوانی سے سارا رس نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ اپنی خالی آغوش سے حسن کی سارے گداز سے بھر لینا چاہتے تھے، اپنے ارمانوں کی دنیا کو بوسوں کی شہد آگیں لذت سے ہمکنار کر دینا چاہتے تھے، پھر اس کے بعد وہی رتیلے میدان ہوں گے اور وہی خندقیں، جنگلوں میں دشمنوں کی گھات۔

میں سپاہی کو ہمیشہ معاف کر دیتا ہوں، وہ ایک عورت کی عصمت پر ہات ڈالتا ہے۔ تو ہزاروں عورتوں کی عصمت بچا لیتا ہے۔" ادبرائن کا یہ فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شاید اس وقت برما سے بھاگے ہوے ایک ٹھیکیدار نے کہا تھا۔

" صاحب کس کی عصمت وصمت، یہ فلسفہ کھانا کھانے کے بعد سوجھتا ہے، اجی صاحب جب ہم برما سے بھاگے تو ہمارے ساتھ پورا خاندان تھا۔ بیوی تھی، نوجوان لڑکیاں تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے، سب راستے میں مر گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو، اپنی بیوی کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تڑپتے دیکھا۔ میری لڑکیاں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنی عصمت اس خونی سڑک پہ بیچتی نظر آتی تھیں، عصمت؟ الو کا پٹھا ہے، حرامزادہ ہے، وہ جو عصمت کی تقدیس پہ ایمان رکھتا ہے، یہ سب فلسفہ پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتا ہے۔

وہ دیر تک اسی طرح چکتا رہا، ادبرائن کے چہرے سے غبار چھٹنے لگا۔ کہنے لگا، شراب منگاؤ، شراب، بس شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، شراب کبھی نافرمان

نہیں ہوتی، شراب کبھی دھوکا نہیں دیتی، وہ انسان کی طرح ظالم نہیں ہے، خدا کی قسم، ابن مریم کی قسم وہ ہرگز ہرگز ظالم نہیں ہے۔

گہرے نیلے آسمان میں تارے چمکنے لگے، نیڈوز ہوٹل کی پہاڑی پر یکایک بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو اٹھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے بنفشے کے پھولوں کی چھڑی فضا میں اچھال دی اور پھر چاند مغربی افق پر شفق کی آخری لکیر پہ محجوب شرمایا ہوا برآمد ہوا، اس سرد شہ ساقی کی طرح جس نے اپنے دست سیمیں میں پہلی بار مینا اٹھائی ہو۔

اوبرائن پینے لگا، اب اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ آسمان کی طرح صاف۔

کمرہ نمبر سات میں ایک اطالوی بڈھا اور اس کی لڑکی میریا رہتے تھے، میریا دن بھر اپنے کمرہ میں پیانو بجاتی رہتی، اور شام کو اپنے باپ کے ہمراہ سیر کرنے جایا کرتی۔ میریا کے خدوخال میں ایک ایشیائی مناسبت تھی۔ شاید اسی لئے میں اسے اس قدر پسند کرتا تھا، بڈھا اطالوی یہاں پچیس تیس سال سے رہتا تھا۔ بازار میں اس کی ایک دوکان تھی جہاں وہ سامان خورد و نوش رکھتا تھا کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ جس میں زیادہ تر جاسوسی ناول، فحش قصے، بھوتوں کی کہانیاں اور اسی قسم کا ادب تھا، جو سپاہیوں کو اور پڑھے لکھے امرا کو بے حد مرغوب ہے، وہ اس کی لائبریری میں سے کتابیں کرائے پر

پڑھنے کے لئے لے جاتے، بڈھے اطالوی کو چھڑی بنانے کا بہت شوق تھا، اور وہ جنگل کی لکڑیوں سے ایسی خوبصورت چھڑیاں بناتا تھا، جو گل مرگ میں سوغات میں شمار ہوتی تھیں اور سیاح انھیں خرید کر بڑے شوق سے اپنے وطن لیجاتے تھے، اس کے علاوہ اسے "Concertina" بجانے کا بہت شوق تھا رات کو وہ کھانا کھاکر "Concertina" کے ساتھ گایا کرتا اور میریا پیانو بجاتی۔ میریا پیانو بہت اچھا بجاتی تھی، اور جنگ سے پہلے گل مرگ میں اکثر معزز انگریزی خاندانوں میں سکھانے جایا کرتی، جنگ شروع ہوتے ہی یہ دونوں باپ بیٹے حراست میں لے لئے گئے۔ بعد میں جب انھوں نے اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا تو چھوڑ دیے گئے، پھر بھی ان پر کڑی نگرانی تھی، جنگ سے پہلے بڈھے کی دوکان کا نام اطالوی اسٹور تھا، جنگ شروع ہوتے ہی اس نے یہ نام بدل کر "اینٹی اطالوی اسٹور" حراست کے بعد اس سٹور کا نام اتحادی سٹور، ہوگیا، دراصل اس بڈھے کو سیاست سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کل گل مرگ پر جنگل کے ریچھوں کی حکومت ہو جائے، تو یہی اطالوی بڈھا اپنی دوکان کا نام بدل کر "ریچھ سٹور" رکھ دیگا اور ساتھ ہی جلی حروف میں یہ "یہاں پر ریچھوں کو شہد مفت ملتا ہے"! لیکن فی الحال تو اس حکومت کے قیام کا کوئی گمان نہ تھا، جنگ شروع ہو جانے کے بعد میریا کے انگریزی خاندانوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ اور پیانو سکھانے سے

جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُدھر اطالوی یعنی اینٹی اطالوی یعنی اتحادی اسٹور کی آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس لئے حالت ذرا پتلی تھی، فردوس کے چھوٹے بیرے زماں خاں نے یہ سب حالات دیکھ کر میریا پر اپنے دام پھینکا تھا، لیکن میریا قابو میں نہ آئی، بعض غریب لوگ بیحد ڈھیٹ ہوتے ہیں، بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ میریا کا شمار انہی مشکلوں میں ہوتا تھا۔ زماں خاں اس کی وجہ سے بیحد پریشان تھا، ہوٹل کے بڑے بہشتی عبداللہ کو اسی وجہ سے میریا اور اس کے باپ سے ہمدردی تھی، کیونکہ وہ خود ایک لٹا ہوا کسان تھا۔ سینے میں ایک زخمی دل رکھتا تھا، اسی وجہ سے اس کی لڑائی زماں خاں اور چھوٹے بہشتی سے ہوئی، جو کمرہ نمبر سات کا کام دلجمعی سے نہ کرتے تھے اور زماں خاں تو کمرہ نمبر سات کا کام کرنے کے بجائے لڑکی کو الٹا پریشان کرتا تھا عبداللہ اس لڑائی میں بری طرح پٹ گیا، ہات پاؤں پر چوٹیں بھی آئیں اور منیجر نے الگ ڈانٹا، کیونکہ کمرہ نمبر سات کی دیکھ بھال زماں خاں اور یوسف کے سپرد تھی، عبداللہ کو دخل در معقولات کا کیا حق تھا، اب کے اس نے اپنی ہمدردی یوں ظاہر کی تو نوکری سے الگ کر دیا جائے گا۔

میریا مجھے پسند تھی۔ اس کا حسن صبیح، کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ، آنکھوں کی خطرناک معصومیت، جسم کے نازک خم، ہونٹوں کا وہ اُجلا اُجلا تبسم، لیکن میریا کی متانت مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی، میں چاہتا تھا کہ یہ لڑکی متین نہ رہے

ان معصوم آنکھوں میں شوخی جھلکنے لگے، اس کنول کی پتیوں پر ہنسی کی تتلی رقصاں ہو جائے، اس اجلے تبسم میں شرارت کی بجلی تڑپ جائے۔ اس کے سارے رگ و پے میں ایک ایسی تھرتھری آئے کہ اس کی ہستی کا گوشہ گوشہ بیدار ہو جائے اور اس کی حیات کا بہاؤ کسی طوفانی ندی کی طرح امنڈتا ہوا نظر آئے۔

—— میریا۔—— میریا۔۔۔ ایک دن پیانو پر "NOTCRACKERS" کی دھن بجا رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا، یا تو تم نری احمق ہو بیوقوف ہو، جاہل ہو یا:

"یا۔۔۔ ہاں کہو۔"

یا تم عورت کے بھیس میں راسپوٹین ہو۔ "NUTCRACKER" کی دھن سن کر مجھ ایسے کورمغز ایشیائی کا جی بھی ناچنے کو چاہتا ہے اور ایک تم ہو کہ بجھے ہوئے بلب کی طرح بالکل ٹھس بیٹھی ہو، کیا بات ہے، آخر اٹھو، دوڑو ناچو، ناچو حتے کہ تمہاری کائنات کا ذرہ ذرہ متحرک ہو جائے اور تمہارے جسم کا ایک ایک خم تھک کر چور ہو جائے، یہ کہہ کر میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پیانو پر سے اٹھا لیا اور دو تین چکر کمرے میں تیزی سے ناچتے ہوئے لگائے پھر یکایک ٹھہر گیا، اب وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔ "اس جنگ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے!"

اس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر لیا اور میرے منہ پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی "تم بڑے وحشی ہو جی"۔

میں نے کہا۔" میں یہی غصہ دیکھنا چاہتا تھا، مجھے تمہاری اس متین مسکراہٹ سے سخت چڑ ہے، تمہارے انداز اطالوی لڑکیوں ایسے نہیں ہیں۔

وہ مجنونانہ جوش وخروش، وہ بے موقع ہنسی، اچھل کود، وہ۔ وہ سب کچھ تم میں نہیں ہے، واللہ! تم عورت نہیں ہو، مرمر کا بت ہو، اور یا تو تم اپنی زیست پر دانستہ اس بھاری متانت کا دبیز پردہ ڈالے ہوئے ہو، تاکہ لوگ تم سے مرعوب ہو جائیں۔ یورا سپوتین گرل..... ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔

وہ کہنے لگی "جب تم میری عمر کو پہنچو گے۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔

میں نے کہا" میں تم سے عمر میں دس سال بڑا ہوں"۔

میریا بولی" میری مراد ذہنی عمر سے تھی۔ اصل عمر تو وہی ہوتی ہے یوں تو شاید تم مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ہو گے لیکن تمہارا ذہن، تمہارا فہم تمہارا ادراک بالکل مرغی کے ایک چھوٹے چوزے کی طرح ہے۔

اچھا تو گویا میں ایک چوزہ ہوں۔ میں نے غصہ سے اس کی کمر میں ہات ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک ناپخت چوزہ" یہ کہہ کر وہ مسکرائی، وہی متین غم آلود مسکراہٹ

میں نے پوچھا۔ اس جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"۔

وہ کہنے لگی "جنگ —— جنگ —— تمہارا بوسہ بہت اچھا تھا۔ جنگ بہت بری شے ہے۔ میں ایک عورت ہوں، میں آدمی کے بوسے کو سمجھ سکتی ہوں، اس کے قاتلانہ جذبے کو نہیں سمجھ سکتی، یہ کشت وخون کیوں ہوتا ہے میرا بھائی اس وقت فوجی قیدی ہے"۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"میں نے کہا معاف کرنا یہ جنگ تمہارے فسطائیوں نے شروع کی ہے

وہ بولی" میں فسطائی نہیں ہوں، نہ ہی میرا بھائی فسطائی تھا۔ میرا باپ چھڑیاں بناتا ہے اور رات کو "Concentina" پر گانا پسند کرتا ہے مجھے پیانو سے عشق ہے، میں نے کبھی سیاست کے متعلق نہیں سوچا، ہمیشہ آزاد اور لاتعلق سی رہی، اسی لئے مجھے فسطائیت پسند نہیں جب میں پیدا ہوئی تو عہد نامہ ورسائی پر دستخط ہو چکے تھے۔ اور میں ہندوستان میں تھی مجھے مسولینی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس نے تو میرا پیانو سکھانا بھی بند کر دیا۔

اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میں نے کہا،" تم کسی پولیس آفیسر کے سامنے بیان نہیں دے رہی ہو۔

وہ بولی۔" مجھ سے تو سبھی پولیس آفیسروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ نئی بات نہیں ہے، لیکن دراصل یہ ہماری غلطی تھی، ہم خوشی کے راگ الاپتے رہے" Concantina" بجاتے رہے، اور سیاست سے بے بہرہ رہے، اور ہم نے فسطائیوں کو من مانی کارروائی کرنیکا موقع دیا۔

——— اس کی سانس رُکنے لگی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا "اچھا چلو جانے دو، یہ آخری جنگ نہیں ہے اگر ہم لوگ پچیس تیس برس اور زندہ رہے تو ایک اور جنگ دیکھیں گے، اس سے کہیں بھیانک اور خوفناک جنگ، یہ جنگ انسانوں کو تو شاید تباہ کر دے۔ لیکن مشرق و مغرب کے نازک مسائل کو نہ سلجھا سکے گی نہ یہ دنیا اس اشتراکی نظام کی بنیاد رکھ سکے گی، جس کے بغیر بھوک، بیکاری اور جہالت کا اس کرۂ ارض سے دور ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے آؤ، بیتھوون کا 'Moonlight Sonata' شروع کرو تاکہ اس زندگی کی حرماں نصیبی اور اپنے محبوب آدرش کی دوری کا احساس زائل ہو جائے۔

میریا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور پیانو بجانے لگی۔

چاندنی رات تھی، میں اور اوبرائن کھانے کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے اپنے تخیل میں ہوائی قلعے تعمیر کر رہے تھے میں سوچ رہا تھا کہ اتھرکی جھیل کی وسط میں برف کے گلیشیروں کے درمیان ایک خوبصورت محل ہو اور اس میں میریا ہو اور ایک بہت بڑا پیانو چاندی کا اور میریا کا لباس سیب کے پھولوں کا ہو...... اور میریا ہو اور میں...... اور ——— بس... او

کوئی نہیں...۔ آتو کہیں کا، لوگ بھوکے مر رہے ہیں، آٹا روپے کا دو سیر بک رہا ہے اور جناب سوچ رہے ہیں، کہ اک چاندی کا پیانو، جھیل کے وسط میں ایک محل ہو، یہ ہو، وہ ہو، بس ہمیشہ یہی مصیبت ہوتی ہے ایسے خوبصورت سپنے اسی طرح جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، لیکن آدمی ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے، آدمی سے مراد کیا چیز ہے۔ عبداللہ بھی تو آدمی ہے، عبداللہ نے بھی کبھی ایسے خواب دیکھے تھے، اب بھی اپنے بیٹے کے لئے شب و روز ایسے ہی سپنے دیکھتا ہے، انسان کو یہ سپنوں کی دنیا کیوں پیاری ہے، اور کیوں وہ ان سپنوں کو حقیقت نہیں بنا لیتا، سورج، پانی، چاند، ہوا کی طرح اگر زمین اور اس کی ساری پیداوار بھی سب انسانوں میں مشترک ہو جائے تو ہر گھر ان سندر سپنوں کا جگمگاتا ہوا شیش محل بن جائے، پھر انسان ایسا کیوں نہیں کرتا، وہ کیوں غاصب ہے، اشتراکی کیوں نہیں، کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں کہ اس سیدھی سادی بات کو سمجھ لے"

اوبرائن سگار کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ "ہنری فورڈ کا لڑکا مر گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "پھر؟ اس سے موٹروں کے کاروبار پر کیا اثر پڑیگا؟ شہتوت کے درختوں پر پھل لگنے بند ہو جائیں گے کیا؟

اوبرائن بولا "نہیں میں دراصل غور کر رہا تھا کہ وہ ہنری فورڈ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہنری فورڈ امریکہ میں سرمایہ داری کا مظہر ہے۔

اب میں سوچتا ہوں، سرمایہ دار ہنری فورڈ خوش ہے؟ خوش تھا، خوش رہے گا، آخر یہ دولت کے انبار کیوں؟ ان کا مصرف ہی کیا ہے، جب کہ ہنری فورڈ دو بسکٹ اور آدھ پاؤ دودھ بھی دن میں ہضم نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "ہنری فورڈ بہت بڑا آدمی ہے، وہ اس قدر محنت کرتا ہے کہ کچھ کھا نہیں سکتا۔

اوبرائن بولا "ماؤنٹ ایورسٹ بھی بہت بڑا پہاڑ ہے، بڑائی دونوں میں ہے۔ ہنری فورڈ میں اور ماؤنٹ ایورسٹ میں بھی، لیکن ہنری فورڈ کی عظمت غیر فطری ہے، مصنوعی ہے، اس کی حیثیت غاصبانہ ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی دلکشی اک معصوم بچے کی سی ہے جو سپید برف سے کھیل رہا ہو۔ وہ ابدی ہے۔

میں نے پوچھا گاندھی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

اوبرائن بولا "ایک مدت تک مجھے کالے آدمیوں سے نفرت رہی اب بھی کبھی یہ نفرت جاگ اٹھتی ہے۔ مجھے ان کا رنگ پسند نہیں، ان کا احساس کمتری پسند نہیں، ان کا خوشامدانہ لہجہ پسند نہیں، میرا خیال رہا ہے کہ ان میں بلی کی سی چالاکی اور لومڑی کی سی دھوکا بازی پائی جاتی ہے اور حبشیوں کو تو میں مدتوں انسان سمجھنے سے انکار کرتا رہا گاندھی کالا آدمی ہے وہ کبھی سفید آدمی کا دوست نہیں ہو سکتا، بعض لوگ اسے یسوع مسیح کی طرح معصوم سمجھتے ہیں، میں اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہوں، میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ

سفید نسل کے انسانوں کا جانی دشمن ہے۔

میں نے کہا وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت ہو۔" اوبرائن بالکونی پہ جھک گیا۔ بولا۔ ممکن ہے میرے جذبات عصبیت سے خالی نہ ہوں۔ آخر میں بھی سفید نسل سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اس وقت اس نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان بھر میں اک آگ سی پھیلی ہوئی ہے اور یہ بدامنی ہمیں جاپانیوں کا مقابلہ کرنے سے روک رہی ہے۔

عین اسی وقت زور سے بگل بجنے کی آواز آئی، اور بہت سے گھوڑوں کی چاپ، انگریز گھڑ سواروں کا اک قافلہ ہماری بالکونی کے نیچے سے گذر رہا تھا۔ یہ لوگ پستولوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ آگے آگے دو انگریز بگل بجا رہے تھے۔

یہ قافلہ بالکونی کے نیچے سے گذرتا ہوا گالف کورس کی طرف چلا گیا۔"

میں نے کہا "بداعتمادی سے بداعتمادی پیدا ہوتی ہے، یہ زندگی کا اصول ہے۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی جمہوریت پسندی پر اعتماد نہیں اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کی ہمدردی اور رواداری پر اب دیکھئے یہاں گلمرگ میں کوئی فساد نہیں، لیکن یہاں بھی یہ لوگ ہر روز رات کو گشت کرتے ہیں اور ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے تک گھومتے ہوئے سارے

گلمرگ کا چکر لگاتے ہیں۔ مبادا کوئی کانگریسی بم پھینک دے"۔

سرکلر روڈ کی سمت سے وہ نوجوان جوڑا چلا آ رہا تھا۔ چاندنی میں شرابور دل آسودہ، امنگوں سے لبریز، نچلی منزل میں بس جائس جو لنکا شائر کی رہنے والی تھی نہایت اداس سروں میں اپنے وطن کا ایک دیہاتی گیت گا رہی تھی، اس کا نیا یار شرابی لہجے میں بار بار کہہ رہا تھا، ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں، ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں"۔

چاندنی میں نہائے ہوئے بتِ سیمیں کو اپنی آغوش میں لے کر نوجوان لڑکا سڑک پر کھڑا ہو کر دریں اپنی بیوی کو چومنے لگا۔

نچلی منزل پر یکایک نرس رونے لگی"۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں، ڈارلنگ براؤے، میں گھر جانا چاہتی ہوں"۔

اوبرائن کہنے لگا" انسان ابھی جغرافیائی عشق سے آزاد نہیں ہوا۔ گاندھی ہندوستانی ہے اسے ہندوستان سے عشق ہے، یہ نرس لنکا شائر کی رہنے والی ہے، اسے لنکا شائر سے عشق ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گلمرگ کے مقابلے میں لنکا شائر بالکل .. .. " وہ سر ہلا کر چپ ہو گیا میں نے کہا پرسوں نگی مل کی دوکان پر میری ملاقات ایک انگریز دوشیزہ سے ہوئی۔ وہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی ممبر تھی وہ بھی تمہاری طرح گاندھی کو برا بھلا کہہ رہی تھی، کہتی تھی کہ اب گلمرگ میں بھی فساد ہوگا، اور یہی لوگ

جو آج ہمارے پاس شہد، ڈبل روٹی اور شلغم بیچنے کے لئے آتے ہیں، ہم پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کریں گے، پھر وہ مسکرا کر کہنے لگی، یہ بہتر ہے کہ میں ان لوگوں کے ہاتھوں ماری جاؤں جو مجھے جانتے ہیں۔ مجھے اجنبیوں کے ہاتھوں سے مرنا پسند نہیں۔

اوبرائن بولا۔ تم نے اس کی طنز کا ملاحظہ کیا۔

میں نے کہا۔" یہ طنز سراسر غلط تھی، گاندھی کسی انگریز کو قتل کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس انگریز دوشیزہ کو جو لیبر پارٹی کی ممبر بھی تھی ہندوستانیوں سے اس قدر خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا، یہ اتنی بد اعتمادی کس لیے، تمہارے خیال میں کیا اس میں رتی بھر احساس گناہ شامل نہ تھا۔

نیچے نرس اب زور زور سے چلا رہی تھی۔ میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں بلی براؤے، میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں، بلی براؤے۔

اوبرائن مسکرا کر کہنے لگا۔ " اور یہی گاندھی چاہتا ہے۔

یکایک عبداللہ کا لڑکا غریب بھاگتا ہوا آیا، اور چھوٹتے ہی بولا بابو جی بابو جی، ابا کو کچھ ہو گیا ہے، ابھی چنگے بھلے تھے۔ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ پھر کھانسنے لگے اور ایک دم چپ ہو گئے"، میں نے کہا ابا، ابا وہ نہیں بولے، وہ بولتے ہی نہیں بابو جی.... میں بھاگا بھاگا نیچے گیا، عبداللہ اپنی کوٹھری میں مرا پڑا تھا، آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں، سینوں کا

انتظار کرتے کرتے، ہائے کتنی ناامیدی تھی، ان آنکھوں میں، یہ سپنے کبھی سچے نہیں ہوتے۔

منیجر دروازے تک بھاگا ہوا آیا۔ اس نے عبداللہ یا میری طرف دیکھا تک نہیں غریب کو دیکھ کر بولا۔ "منیجر صاحب کے لئے پانی ۔۔ گرم پانی چاہئے۔ جلدی ٹب بھر دو۔"

اور وہ بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔

غریب نے قاعدہ زمین پہ رکھ دیا اور بالٹی اٹھانے لگا۔

"میرے ابا کو جگا دیجئے۔" اس نے ایسے سادہ لہجے میں نہایت لجاجت سے کہا۔ میں منیجر صاحب کے لئے پانی رکھ آؤں۔

قریب کسی کمرہ سے آواز آ رہی تھی، لنکا شائر کی رہنے والی نرس کو اس کا نیا یار چوم رہا تھا اور اسے مخصوص شرابی لہجے میں دلاسا دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں تجھے لنکا شائر لے جاؤں گا۔ ۔ کم یو سویٹی،

عبداللہ آج ہی کیوں مرا۔ ایسی خوبصورت چاندنی رات میں، وہ نوجوان لڑکا اور لڑکی ابھی تک گلمرگ کی چاندنی میں نہا رہے تھے، ہواؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ کیا عبداللہ آج سے چند سال بعد نہ مر سکتا تھا، شاید اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر اس کے تخیل کے سپنے سچے کر دیتا، یعنی یہ کون سا طریقہ ہے مرنے کا، صاحب لوگوں کے لئے پانی کی بالٹیاں

بھرتے بھرتے مر گیا۔ کیا وہ اپنے کھیتوں میں اپنے چھوٹے سے باغیچے میں اپنی مٹی کے گھر میں نہ مر سکتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں۔ یہ کیسا مذاق ہے۔ اسے اس طرح مرنے کا کیا حق تھا۔ وہ اس طرح کیوں فاقے کرتے کرتے ایڑیاں رگڑتے رگڑتے جھوٹے سپنے دیکھتے دیکھتے مر گیا۔ دنیا میں لاکھوں کروڑوں عبداللہ شب و روز اس طرح کیوں مرتے ہیں؟ کیوں جیتے ہیں؟ کیوں رہتے ہیں؟ یہ کیا مذاق ہے۔ کیسا تماشا ہے؟ کیسی خدائی ہے؟

"عبداللہ، ابے سور کے بچے، منیجر صاحب پانی مانگ رہے ہیں۔"
منیجر کہیں دور چلّایا۔ بول بول اے سور کے بچے، سفید سفید پتلیوں والے، غلیظ بڈھے، گنجی چاند والے، کھردرے ہاتھ پاؤں والے نیم برہنہ، فاقہ مست انسان بول، کیا مر کر بھی تجھے گالی کا جواب نہ دینا آئے گا۔

نروس میں دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سے چہرے یاد آ رہے ہیں، ایک سکھ اور اس کی خوبصورت بیوی جو گلمرگ دیکھنے آئے تھے، اور اس لئے وہ واپس چلے گئے کہ گلمرگ میں پہاڑ کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ سردار کی بیوی ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کر بڑے نخرے سے کہنے لگی۔ "اے ہے" یہاں ہے کیا بس پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ مجھے تو کشمیر ذرا بھی اچھا نہ لگا، بس یہاں ہیں کیا۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔

گلیوں کے کتے!

ایک بوڑھا پنشن یافتہ غریب اور اس کے ساتھ ایک انگریز پادری فوج میں ملازم تھا، سرکاری فوج میں عیسائیت کا مبلّغ، پھر بھی یہ احساس کمتری اسے کھائے جاتا تھا کہ ہائے وہ پادری ہے کاش وہ تجار، سپاہی ایکٹر، منسٹر کیوں نہیں ہوا، کتنی بیچارگی تھی، ان آنکھوں میں، وہ پریشان کھوئی کھوئی آنکھیں۔

بوڑھا وزیر ہر وقت اپنے بڑے لڑکے کا ذکر کرتا، جو سکاٹ لینڈ میں تھا اور ہندوستانی ہوتے ہوئے ایک سکاچ کے گھر پرورش پا رہا تھا بوڑھا وزیر بڑے فخر کے ساتھ بار بار اس امر کو ہوٹل کے ملاقاتیوں کے سامنے دہراتا۔

جمال میرا بیٹا ہے، جمال سکاٹ لینڈ میں ہے، جمال میرا بیٹا، جمال سکاٹ لینڈ میں ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک اور بری عادت بھی تھی، وہ میری بالکونی میں مجھ سے اجازت لئے بغیر آ بیٹھتا اور پھر میرا باتھ روم بھی استعمال میں لے آتا جو بالکونی سے کچھ ہی فاصلہ پر تھا" ایک دن میں نے چڑ کر کہا "صاحب آپ یہ بالکونی اور یہ باتھ روم میری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتے"

"کیوں؟ اس نے بیحد ناراض ہو کر پوچھا
اس لئے کہ جمال آپ کا لڑکا ہے، اور جمال سکاٹ لینڈ میں ہے، اور جبتک

وہ ذات شریف یہاں تشریف لائیں، میں آپ کو آپ کی پادری دوست سمیت اس بالکونی سے نیچے پھینک دینے کا خوفناک ارادہ رکھتا ہوں۔

لیکن آپ مجھے نہیں جانتے اس نے اور بھی برافروختہ ہو کر کہا، یہاں کے سب لوگ، سب بڑے بڑے لوگ میرے دوست ہیں، میں منسٹر رہ چکا ہوں اور وائسرائے بہادر کا مہمان بھی رہ چکا ہوں، میں آپ کو جیل بھجوا سکتا ہوں آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔

میں نے تہدیدی انداز میں اسے گھونسہ دکھاتے ہوئے کہا، بہتر ہوگا کہ آپ بھی سکاٹ لینڈ تشریف لے جائیں۔ کم از کم بالکونی کی طرف تشریف نہ لائیں، ورنہ۔

پانچ چھ، تماشہ دیکھنے والے ملاقاتی اکٹھا ہو گئے، آپ نے ان کی طرف مڑتے ہوئے کہا، واہ یہ بھی کوئی بات ہے، میری اس طرح کوئی بے عزتی کرے میں پنشن یافتہ منسٹر ہوں، میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔ اور پادری اسے گھسیٹ کر پرے لے گیا۔

ایک ہندوستانی لڑکی آئی تھی، کمرہ نمبر بیالیس میں آ کر رہی، نہ وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی، نہ ہیڈ منسٹر، نہ طوائف نہ شادی شدہ خاتون، لیکن پھر بھی اکیلی آئی تھی اور جتنے دن گلِ مرگ میں رہی اکیلی رہی اور اکیلی واپس گئی۔

اوبرائن کہنے لگا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اپنی محبوبہ کی یاد تازہ

ہوجاتی ہے، بالکونی کے منظر نے مجھے اس سے بھی متعارف ہونے کا موقع دیا۔ اور برائن نے پوچھا، کیا آپ پچھلے جنم میں کسی آئرستش خاندان میں پیدا ہوئی تھیں۔

اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا، مجھے یاد نہیں،

ہائے کیا بھولپن تھا، کتنی معصومیت تھی، اور برائن کا برا حال ہوگیا، کہنے لگا ہونہہ، یہ وہی ہے مجھے دھوکا دینے کے لئے ہندوستانی لڑکی کے بہروپ میں آئی ہے۔ چند روز اور یہاں رہی تو میں مرجاؤں گا، میرا سارا فلسفہ ختم ہوجائے گا —— مجھے یاد نہیں —— ہائے ہائے ——

خیریت ہوئی کہ چند روز کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

بالکونی میں ایک سہانی دوپہر، لطیف خنک دھوپ، پلیٹوں میں سیب اور مصری آلوچے، میریا کی سنہری باہیں اور پھول کی کلیوں کی طرح نازک انگلیاں، میریا کہنے لگی وہ پک نک تمہیں یاد ہے، ہم دونوں نے فیروزپور کے نالے میں سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی اور FISH ERIES کے محکمے کے ایک کارکن نے ہمیں بلا اجازت مچھلیاں پکڑنے پر گرفتار کرنا چاہا تھا

میں نے جواب دیا۔

—— ام —— ام —— اس نے ایک آلوچہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب ہے

وہ پک نک بری تو نہ تھی، اب پھر چلو، اب کے ہم FISHERIES کے محکمے سے اجازت بھی لے لیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے تو اس پک نک میں صرف اخروٹوں کا تکہ پسند آیا تھا اور بید مجنوں کا جھنڈ جہاں نالے کا پانی بھی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا، اور بید مجنوں کی شاخیں پانی پر جھکی تھیں۔

"اور چنار کے پتوں کا رنگ شرابی تھا" میریا نے خوابیدہ لہجے میں کہا

بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح" میں نے شوخی سے کہا

"بچے ہو" بس مٹھائی دیکھ کر للچاتے ہو، تمہیں تو عشق کرنا آتا نہیں۔

میریا نے ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ کہا، "شاید اسی لئے مجھے تم اس قدر پسند ہو

بہت دیر تک خاموشی رہی، میں اپنی کھال سہلاتا رہا

"پھر وہ بولی، جنگ کے بعد میں اپنے وطن واپس چلی جاؤں گی، وہاں اشتراکی پارٹی میں شامل ہوکر سیاسی کام کروں گی، پیانو بجانے سے کام نہ چلے گا، یہ کمبخت جنگ ختم ہوجائے، پھر ہم سب مل کر پوری کوشش کریں گے کہ جنگ دوبارہ نہ ہو، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا "مجھے بھی ساتھ لیتی چلو گی؟

ضرور، وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ہمارا گاؤں تو مبارڈی میں ہے۔ وہاں انگور کی بیلیں ہیں اور شہتوت کے درخت اور کھیتوں کے کنارے

کنارے لائم کے پیڑ، تب تک میرا بھائی بھی آزاد ہو جائے گا۔
پھر ہم سب مل کر کھیت بوئیں گے اور ریشم کے کوے اکٹھے کریں گے۔
اور پاپا کو ایک اونچی سی کرسی پر بٹھا کر اصل اطالوی شراب پلائیں گے اور پھر کبھی جنگ نہ ہونے دیں گے۔"

دوسرے دن میریا اور اس کے باپ کو پولس نے پھر حراست میں لے لیا یہ گرفتاری بطور حفظ ما تقدم عمل میں لائی گئی تھی۔ جنگ آخر جنگ ہے اور فی زمانہ اشتراکی اطالویوں اور فسطائی اطالویوں میں تمیز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور گو حکام کو ان دونوں افراد پر شبہ نہ تھا، پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

چلتے وقت میریا کے باپ نے مجھے ایک چھڑی بطور تحفہ پیش کی
میریا نے ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اور میں تمھیں کیا دوں ناچیز چھوڑے۔"
میں نے پیانو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ " میں تم سے نغمۂ بہار سننا چاہتا ہوں۔ بے تھوون کا نغمۂ بہار، میرا یقین ہے کہ بہار ضرور آئے گی۔
وہ پیانو پہ نغمۂ بہار بجانے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور نغموں کی پہنائیوں میں خوش الحان طیور چہچہانے لگے، پھولوں بھری

ڈالیاں لہلہانے لگی۔ شہتوت کے پتے خوشی سے ناچنے لگے، بلبل کے نغمے اور عورتوں کے مسرت بھرے قہقہے، اور بے فکر بچوں کی معصوم شوخیاں، بہار بہار بہار۔

میریا کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے
بہار ضرور آئے گی۔ اک دن انسان کی اجڑی کائنات میں بہار ضرور آئیگی
یہ نغمہ کہہ رہا ہے میریا۔ تیرے آنسو بیکار نہ جائیں گے۔

کشمیر کو سلام

یہ بات کہ کشمیر جنت نظیر ہے مجھے اس وقت تک نہیں معلوم ہوئی جب تک میں اس جنت سے باہر نکلا نہیں گیا، میرا مطلب یہ ہے کہ میں چونکہ بچپن ہی سے کشمیر میں رہتا بستا چلا آیا تھا، اس لئے میرے لئے کشمیر کے مرغزاروں کی خوبصورتی، اس کے وادیوں کی دلکشی، اس کی جھیلوں کی رعنائی اور اس کے پہاڑوں کی پھبن اور موہنی کوئی اچنبھے کی بات نہیں، میں سمجھتا تھا، شاید دنیا میں اسی قسم کی خوبصورتی ہوتی ہوگی، ایسے حسین مناظر ہر جگہ پائے جاتے ہوں گے، ہر جگہ ڈوبتا ہوا سورج اسی طرح جھیل کی نیلاہٹوں میں سونا رولتا ہوگا، اسی طرح شبنمی دھند لکوں میں کسی انجان گھاٹی پر لاکھوں رنگا رنگ پھول کھِل جاتے ہوں گے، پہاڑ کے تناور درختوں کا جھنڈ اسی طرح خاموش کسی پر اسرار درّے پر کھڑا ایک سلسلۂ کوہ سے دوسرے سلسلہ ہائے کوہ کو دیکھتا ہوا شہد کے چھتوں میں کام کرتی ہوئی شہد کی مکھی کی گونج سے چونک پڑتا ہوگا۔ جس طرح شفق زار ڈال میں چپو چلاتی ہوئی کسی نازک اندام کشمیری حسینہ کے ہاتھوں سے برف پوش چوٹیوں کا عکس چونک کر ٹوٹ جاتا ہے، یہ اور ایسے ہزاروں خوبصورت مناظر دوسری جگہوں پر پائے جاتے ہوں گے، ایسا میں اپنے بچپن

میں اپنے لڑکپن میں اور اپنے جوانی کے پہلے دنوں میں سوچتا تھا۔

لیکن جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے والدین کی مرضی سے کشمیر کے باہر گیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنا غلط سوچا کرتا تھا، جنت کی قدر جنت سے باہر نکل ہی کر معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات نہ تھی کہ کشمیر کے باہر دنیا خوبصورت نہ تھی۔ ساری دنیا حسین ہے۔ دلکشی، رعنائی اور موہنی دنیا کے ہر کونے میں ہے، لیکن فطرت کی جو رعنائی، رنگ اور نکھار میں نے کشمیر میں دیکھا ہے کہیں اور نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ مرتب صورت میں کبھی نہیں دیکھا۔ ممکن ہے یہ میرے بچپن کا خیال ہو اور آپ جانتے ہیں کہ بچپن کے خیالات کتنے مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ کس طرح دل کے رگ و ریشے میں اپنی جڑیں پھیلا لیتے ہیں۔ میں نے ایسے دوستوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے گاؤں کے املی کے جھاڑ کا ذکر بھی اسی انداز سے کرتے ہیں جس انداز سے میں کشمیر کے گل پوش وادیوں کا ذکر کرتا ہوں۔ شاید جنت کسی انسان کے دل کے باہر نہیں ہے۔ وہ اس کے دل کے اندر ہے اگر ایسا ہے تب بھی مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میرے دل کے اندر جو جنت ہے وہ کشمیر ہے۔

آج کل میں اس جنت سے بہت دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی اس کی یاد کسی سدا بہار پھول کی طرح دل میں ہر وقت مہکتی رہتی ہے، اور جب میں صبح و شام بھورے بھورے سفید بادبانوں والی کشتیوں کے پرے سمندر میں سورج کی کرنوں

کو اپنا زریں جال پھینکتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے وہ صبح یاد آجاتی ہے، جب میں نے پہلی بار جھیل ولر کو دیکھا تھا اور ہلکی ہلکی دھند ایک ریشمی آنچل کی طرح بار بار گالوں سے چھو جاتی تھی اور جھیل کی نیلی سطح ساکن تھی اور دور دور نیلگوں پہاڑ ایک دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے، اور چپو میرے ہاتھ میں رک گیا تھا، اور میری کشتی کے قریب نیلوفر کے پھول مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور دور ایک بڑی سی کشتی میں ایک ملاح بیٹھا تھا اور اس کی بیوی ایک بچے کو گود میں لئے کھڑی تھی، اور ادھر دیکھ رہی تھی جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے، مجھے اس وقت وہ ماں بالکل مجسم دعا معلوم ہوئی، جیسے دھرتی ماں ہو اور آسمان کائنات کا مندر ہو اور بچہ لوبان کی مہک ہو اور پھر نیلگوں چوٹیوں سے سورج ابھر آیا، اور یکایک بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، اور ساری دنیا جاگ گئی، اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ملاح کا چپو اور نیلوفر کے کانپتے ہوئے پھول، اور جھیل کی طرح خاموش سطح، اور پہاڑوں کی نیلگوں چوٹیاں سانس روکے اس ہنسی کی منتظر تھیں، سورج نکلا، بچہ ہنسا اور دنیا جاگ گئی۔ اور رنگوں سے معمور ہوگئی۔

یاد کی سرئی وادیوں میں کشمیر کے کئی نگینے چمک اٹھتے ہیں، بہرام گلے سے ایک وادی تھی، جہاں میں راستہ بھول کر آنکلا تھا، مکئی کا ایک ڈھلوان کھیت تھا، جس میں فصل اچھی طرح پھولی پھلی نہیں تھی، مکئی کے پودے چھدرے

چھدرے تھے اور آڑے ترچھے اگے ہوئے تھے۔ کھیت کے بیچ میں ایک مچان تھا جو بھوری گھاس سے چھتا ہوا تھا، لیکن مچان پر کوئی نہ تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا آگے گھاس کا ایک لمبا سا قطعہ تھا۔ جس میں ڈیفی ڈول کے پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے اس سے آگے اونچائی پہ آلوچے کا ایک پیڑ تھا جو سفید سفید پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے قریب ایک چھت تھی جس پہ اس کے گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے، ایک بڈھا موچی تھا، جس کی سفید ڈاڑھی تھی اور تانبے ایسی رنگت تھی، ایک اس کا جوان بیٹا تھا جس کی نیلی آنکھوں میں ایک خوش آئند تبسم تھا۔ ایک اس جوان بیٹے کی خوبصورت بیوی تھی۔ جس کی گود میں ایک پیارا سا بچہ تھا، دو بہنیں تھیں۔ ایک ان کا چھوٹا بھائی تھا جس نے صرف ایک میلی چکٹ سی قمیض پہن رکھی تھی اور جو مجھے کھاتے کھاتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا اور پھر ہنسنے لگا تھا اور چاول اور کرم کا ساگ اس کی انگلیوں سے لگا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جو اجنبی کو دیکھ کر ہوتی ہے اور لبوں پہ وہ تبسم تھا جو ڈر سے نہیں بےفکری سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے دیکھ کر بڈھا موچی مسکرایا، اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کدھر جا رہے ہو، تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارا مذہب کیا ہے؟ اور اس نے مجھ کو کھانا کھانے کو کہا، اور میں وہیں اس سرخ بجری کی چھت

بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا اور ایک بہن نے میرے سامنے مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ رکھ دیا اور سفید مکھن کا ایک گولا اور سرخ پسی ہوئی مرچیں اور نمک میں کھانے لگا اور ہم لوگ اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے وہ لوگ برسوں سے مجھے جانتے ہیں، جیسے میں ان کے گھر کا ہی ایک فرد ہوں اور کھانا کھا کر بڈھا موچی ایک چھوٹے سے رندے سے چمڑا کمانے لگا اور جوان بیٹا کھلی ہوئی دھوپ کو تیز سمجھ کر آلوچے کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ایک پرانے جوتے میں تلا لگانے لگا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی ہمارے پاس آن بیٹھی۔ اور چادر کی اوٹ میں اپنے بچے کو چھپا کر دودھ پلانے لگی اور جوان موچی مجھ سے کہنے لگا، اب کی مکئی کی فصل اچھی نہیں ہوئی ہے اسے اولے مار گئے ہیں اور گھاس بھی جگہ جگہ سے بیٹھ گئی ہے۔" اتنے میں وہ دونوں شریر بہنیں آلوچے کے پیڑ پر چڑھ گئیں اور شاخیں ہلا ہلا کر انھوں نے اتنے پھول ہم پر برسا دیے کہ ہم سفید سفید پھولوں سے لد گئے، اور چھت کے دوسرے کونے کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھا ہوا بڈھا موچی ہنسنے لگا۔

اور کھلی دھوپ میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اور اس کی گہری نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ دونوں شریر بہنیں ہم پر پھول برسا رہی تھیں۔ اور جوان موچی کے سر پر پھول تھے۔ اور جوتے کے تلے کے اوپر پھول تھے، اور پھول میری عینک کی کمانی کے اوپر اٹک گئے تھے اور پھولوں سے

گندے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور جب میں سستا چکا تو میں نے اس بڈھے موچی کو اور اس کے بیٹے کو اور اس کی بیوی کو سلام کیا اور پھر وہ دونوں شریر بہنیں اور ان کا چھوٹا بھائی جس نے صرف ایک میلی چکٹ قمیص پہن رکھی تھی اور جو میری عینک کی طرف دیکھ کر ہنستا تھا وہ تینوں مجھے ڈھلوان سے آگے راستہ بتانے کے لئے آئے اور جب وہ مجھے راستہ پر لگا چکے تو چشمے کے کنارے کھیلنے بیٹھ گئے اور شاید دوسرے لمحے ہی میں مجھے بھول گئے۔ لیکن میں انھیں نہیں بھولا ہوں وہ بے لوث ہنسی، وہ پاک محبت، مہر و وفا کی وہ بے لوث نشانی جو اس زندگی کے سفر میں ایک انسان دوسرے انسان کو دیتا ہے وہ آج بھی میرے سینے میں اسی طرح محفوظ ہیں۔

مجھے کشمیر گئے ہوئے مدتیں گذر گئیں مگر اس عرصے میں کشمیر بہت کچھ بدل چکا ہے کیونکہ یہ جنت نظیر ملک انسانی جنت ہے اور انسانوں کی جنت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے میں نے اس زمانے میں بھی اس جنت کے دوزخ کے دہکتے ہوئے انگارے دیکھے تھے نکبت و یاس کے مرقعے، افلاس کے بہیمانہ نقوش حسن فردوس کی خرید و فروخت میں جانتا تھا، یہ دہکتے ہوئے انگارے ایک روز بھڑک کر آتش فشاں جوالا مکھی بن جائیں گے اور یہ لاوا دور دور تک کشمیر کے مرغزاروں اور وادیوں میں پھیل جائے گا اور وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، اور کشمیر کی حسین و جمیل وادی خاک و خون میں لتھڑ گئی۔

اور آج میں اپنی جنت نظیر سے بہت دور بیٹھا ہوں اور آج میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ماں کہاں ہے جو طلوعِ آفتاب سے پہلے جھیل ولر کے بیچ میں اپنے نوزائیدہ بچے کو لئے مجسم دعا بن کے کھڑی تھی، اس کا وہ خاوند کہاں ہے جو دونوں ہاتھ چپو دں پر رکھے اس کشتی پر بیٹھا تھا اور اپنی بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

آج میں نہیں کہہ سکتا کہ کشمیر کی عجیب کش مکش نے انھیں کہاں پہنچا دیا ہے، لیکن وہ جہاں کہیں ہوں انھیں میرا سلام پہنچے۔

آج مجھے پھر وہ آلوچے کا پیڑ یاد آتا ہے اور مکئی کے کھیتوں میں بھوری گھاس سے چھتا ہوا مکان اور سرخی بجری کی چھت پر بیٹھا ہوا بڈھا موچی جو رندے سے چمڑا چمکا رہا ہے اور پھر میرے سر پر آلوچے کے سفید سفید پھوار گر رہے ہیں۔ اور میرے کانوں میں ان دونوں خستہ بہنوں کی ہنسی ہے اور اس لڑکے کا تحیّر زا تبسم ہے جس نے صرف ایک میلی چکٹ قمیص پہن رکھی ہے اور جس کی انگلیوں میں سفید چاول کے دانے اور کرم کا ساگ لگا ہوا ہے، میں نہیں جانتا وہ لوگ آج کہاں ہیں، لیکن وہ جہاں بھی ہوں انھیں میرا سلام پہنچے۔

شاید وہ آلوچے کا پیڑ آج پھولوں سے لدا نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مکئی کے ڈھلوان کھیت میں کسی نے ہل نہ چلایا ہو، شاید وہ بڈھا موچی اپنے گھر کی سرخ بجری کی چھت پر چمڑا نہیں چمکا رہا ہے بلکہ کسی سڑک کے کنارے پتھر کوٹ رہا ہے اور اس کا بیٹا اس عظیم کش مکش میں اپنی بہنوں کی عصمت کے لئے لڑتے لڑتے

لڑتے لڑتے مارا گیا ہے، شاید آج مکئی کے کھیت میں گھاس سے چھتے ہوئے مکان پر ایک بیوہ بیٹھی ہے جس کی کالی چادر میں نیا کشمیر دودھ پی رہا ہے۔

ممکن ہے یہ سب کچھ صحیح ہو، لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کشمیر ہمیشہ جنت نظیر رہے گا، اس خاک و خون میں لتھڑی ہوئی دادی کو اس کے بچے پھر سے بسائیں گے آلوچے کے پیڑ میں پھر سے پھول کھلیں گے، مکئی کے کھیتوں میں سنہری دانے والے بھٹے پھر سے نظر آئیں گے۔ مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ اور مکھن ہوگا اور بہنوں کی ہنسی ہوگی اور بھائیوں کے قہقہے!

فیروز پوری نالے کے اوپر ایک پن چکی ہے۔ یہاں پتھر کے دو پاٹ تیزی سے گھوم رہے ہیں، پانی پن چکی سے آبشار کی طرح گر رہا ہے، قریب ہی گھاس کے قطعے میں لمبے لمبے ڈنٹھلوں پر بڑے بڑے سفید پھول جھکے ہوئے ہیں، اور ساری فضا میں سونف کے پودوں کی خوشبو ہے۔ میں نے اس مقام پر بیٹھے بیٹھے گورکی کا ناول "ماں" پڑھا تھا

آج میں پھر وہیں جانا چاہتا ہوں اور اسی پن چکی کے قریب بیٹھ کے وہی ناول پڑھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ کشمیر کی دھرتی گورکی کی "ماں" ہے۔ وہ دھرتی میری ماں بھی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے!"

سڑک کے کنارے

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں اور جھیل ڈل کا نظارہ کر رہا ہوں، میں بہت مدت کے بعد کشمیر آیا ہوں لیکن مجھے ڈل اسی طرح خوبصورت اور جوان نظر آتی ہے۔ اس کے گہرے نیلے پانیوں میں شنکر آچاریہ کے مندر کا عکس لرز رہا ہے اور گہرے نیلے پردوں والے سبک خرام شکارے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نیلوفر کے پھولوں کے قریب سے گذرتے ہیں تو نیلوفر کے خوابیدہ پھولوں پہ پانی کی پھواریں پڑ جاتی ہیں اور وہ چونک کر پانی کی سطح پہ دوڑنے لگتے ہیں، شکارے آگے بڑھ جاتے ہیں اور شکاروں میں بیٹھے ہوئے مرد و زن اور شکاروں کا گیت ڈل کے اجلے اجلے پانیوں سے ابھرتا ہوا آ رہا ہے

باغ نشاط کے گلو
شاد رہو جواں رہو
تم پہ نثار جنتیں
روح فزا سرتیں
رنگ بہار نکہتیں

مست نشے میں رات دن
خرم و شادماں رہو
باغ نشاط کے گلو

ہاں یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے جس کے بیٹوں نے ہزاروں مصیبتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی حسن کاری نہیں کھوئی، اپنے گیت نہیں کھوئے زندہ رہنے کی آرزو اور ہنستے ہوئے محنت کرنے کی امنگ نہیں کھوئی یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو سری نگر سے اننت ناگ جاتی ہے، اس راستے میں شعلہ رو چنار ہیں اور بادا موں کے بانکے پیڑ! ناشپاتیوں کے جھنڈ اور سیب کے درخت، برف زمین میں گھل گئی ہے اور ابھی ابھی تو بہار کا سبزہ بن کر پھوٹی ہے۔ سیب کی شاخوں پہ کلیاں چٹک گئی ہیں اور ان کی گلابی مسکراہٹیں جگہ جگہ راستہ چلنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔ میں بھی یہاں ٹھٹھک جاتا ہوں۔ کیونکہ یہاں سیب کے پھول ہیں، ایک چشمہ ہے، ایک گائے ہے اور ایک حسین چرواہی ہے، جو گائے کو چشمہ سے پانی پلا رہی ہے۔ میں لڑکی سے کہتا ہوں، "تم ذرا گائے کو پرے ہٹا لو تو میں پانی پی لوں"۔

لڑکی: "تم ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ جاؤ اور گائے کو پانی پی لینے دو، وہ تمہارے سے ڈرتی ہے"

وہ میں د... دو مجھے سخت پیاس لگی ہے۔"

لڑکی :۔ پیاس انسان اور حیوان کو برابر لگتی ہے"۔

میں :۔ "پہلے میں پانی پی لوں"

لڑکی :۔ پہلے گائے پانی پی لے" گائے تو دیکھتے نہیں ہو، پانی پی رہی ہے اسے بیچ میں سے کیسے ہٹا دوں"؟ تم پانی پی رہے ہوتے تو میں تمہارے ہاتھ سے پانی کا پیالہ چھین لیتی؟"

میں :۔ (ہنس کر) تم بڑی سمجھ دار معلوم ہوتی ہو۔ مگر حیرت ہے اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی تم چرواہیوں کا کام کرتی ہو"۔

لڑکی :۔ چرواہیوں کے کام کے لئے تو بڑی سوجھ بوجھ چاہئے۔ گائے بھینسوں کے ریوڑ سنبھالنے کے علاوہ اسے تمہارے ایسے راہ پر چلتے ہوئے عقلمندوں سے بھی تو نپٹنا ہوتا ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

میں :۔ "تمہارا نام بیگماں ہے نا"!

لڑکی :۔ (ہنس کر) نہیں میرا نام زینب ہے"۔ میں یہاں گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی ہوں"۔

میں :۔ اسکول میں پڑھاتی ہو کر گائے بھینس چراتی ہو؟

لڑکی :۔ "یہ گائے تو ایک اندھے لڑکے کی ہے، جس کے ماں باپ پنجاب کے فساد میں مارے گئے تھے۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر محنت مزدوری کے لئے پنجاب

گئے تھے پھر انھیں آنا نصیب نہ ہوا۔

میں :۔ یہ اندھا لڑکا کیسے بچ گیا۔ کیا یہاں تھا؟

لڑکی :۔ یہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھا۔ کچھ فسادی اسے بھی مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے رحم کھا کے صرف اس کی آنکھیں نکال دیں اور اسے زندہ چھوڑ دیا اس نے اس دن سے کوئی فساد نہیں دیکھا نہ دکھ سنا ہے صرف ایسی بھیانک آوازیں سنا ہے کہ ہر رات کو سوتے سے جاگ کر چیخنے لگتا ہے "مجھے بچاؤ" "مجھے بچاؤ"

میں :۔ "خیر وہ زمانہ اب گزر گیا"۔

لڑکی :۔ (آہ بھر کے) لیکن اس بچے کو روشنی نہیں ملے گی۔ نہ ہی میرا شوہر مجھے ملے گا"۔

میں :۔ "تمہارا شوہر"۔

لڑکی :۔ ہاں وہ ہمارے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اب اس کی جگہ میں پڑھاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ لیکن یہ فساد سے بہت پہلے کی بات ہے وہ مجھے چھپ چھپ کر پڑھایا کرتا تھا اور میرے ماں باپ میری شادی نمبردار کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے اور میں چھپ چھپ کر پڑھتی تھی اور نمبردار کے بیٹے پر سو لعنت بھیجتی تھی۔ پھر میری شادی کی بات پکی ہو گئی اور پھر دنگے اور فساد کی خبریں آنے لگیں۔ اور پھر جب میری شادی میں چند دن رہ گئے تو یہ اندھا لڑکا گھسٹتا گھسٹتا بھیک مانگتا واپس گاؤں میں آ نکلا۔ اس کو اس حالت میں

دیکھ کر گاؤں والوں کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی

(مجمع کا شور)

(ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ چیخ رہے ہیں
اس بے ہنگم شور میں ذیل کی آوازیں ابھرتی ہیں)

۱۔ "مارو مارو! ان سب کو مارو ایک بھی بچنے نہ پائے"

۲۔ ایک آنکھ کے بدلے دونوں آنکھیں نکال دو"

۳۔ "بنئے کا گھر جلا دو"۔

۴۔ "لالے اور اس کی بیٹی کو زمین میں زندہ گاڑ دو"

۵۔ "چلو۔ جاؤ۔ مارو۔ مارو۔ مارو۔"

۶۔ "ہم خون کا بدلہ چکائیں گے اپنے دشمنوں کا خون بہائیں گے"۔

لڑکی۔ آن کی آن میں سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ دوسرے فرقے کے لوگوں نے گھبرا کر اپنے گھر چھوڑ دئے۔ اور بھاگ کر اسکول کی چہار دیواری میں پناہ لی

گاؤں میں اسکول کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اندر اسکول میں استاد پڑھا رہا تھا۔

اسکول ماسٹر۔ "پڑھو بچو" "سب انسان بھائی بھائی ہیں"

باہر سے آوازیں:۔ مارو۔ مارو۔ سب کو مارو۔

اندر کی آوازیں:۔ ہمیں بچاؤ۔ کسی طرح سے ہمیں بچاؤ"۔

"ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ہم تو سیکڑوں سالوں سے یہاں رہتے

چلے آئے ہیں۔ استاد جی! آپ نے کبھی دیکھا۔ ہم نے گاؤں والوں کے خلاف کوئی بات کی ہو۔

"یہ لیجئے زیور۔ میری بیٹی کی عزت بچا لیجئے"۔

باہر سے آوازیں:۔ "زندہ گاڑ دیں گے، پتھروں سے ہلاک کر دیں گے۔ تیل میں تل دیں گے"۔

اندر کی آوازیں:۔ ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ یہاں سے چار سو میل دور جن لوگوں نے تمھارے گاؤں والوں کی جانیں لی ہیں تم اس کا بدلہ ان سے لو۔ ہم سے کیوں لیتے ہو"۔

ایک لڑکی:۔ بھائی میں تو گاؤں کی کنواری ہوں۔ میں تمھاری عزت ہوں، مجھے بچا لو بھائی"۔

ایک لڑکا:۔ "استاد جی! ہم کیا پڑھیں، سب انسان بھائی بھائی ہیں"۔

استاد:۔ "چپ ــــــــــــ میں باہر جاتا ہوں۔

(قدموں کی آواز۔ باہر کا شور ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ مارو مارو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ قیمہ بنا دو۔ نکالو سب کو باہر ایک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

استاد:۔ گاؤں والو، میری سنو"۔

(سب چپ ہو جاتے ہیں پھر ایک دم چلانے لگتے ہیں)

نہیں، ہم نہیں سنیں گے۔ ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔ ہمیں لہو چاہیئے۔ لہو۔ خون۔"

استاد۔ "تمھیں خون چاہیئے۔ میرا خون لےلو۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم باہر کے فسادیوں کا بدلہ اپنے گاؤں والوں سے لو۔"

ایک آواز۔ "یہ اندھا لڑکا دیکھتے ہو۔ ان لوگوں نے اس کے ماں باپ کو مار دیا اس کی آنکھیں نکال دیں۔ ہم بھی اب یہی سلوک کریں گے۔"

دوسرا۔ "آگے سے ہٹ جاؤ استاد جی!"

تیسرا۔ "میں تم سے کہتا ہوں دروازے سے پرے ہٹ جاؤ۔"

استاد۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مجھے پہلی جماعت کے قاعدے کی حفاظت کرنی ہے۔ جس میں لکھا ہے۔ "سب انسان بھائی بھائی ہیں" اور مجھے میری پیاری اماں جان کی عزت بچانی ہے۔ میں نے دس برس اس قاعدہ کو پڑھایا ہے۔ آج یہ قاعدہ تم مجھ سے چھین رہے ہو؟ میں یہ قاعدہ نہیں دوں گا اپنے جیتے جی۔ میں اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کروں گا۔ گاؤں والو اس قاعدے کو نہ پھاڑو۔ یہ تمھارے بچوں کا قاعدہ ہے اس میں سیب کے پھل ہیں اور ناشپاتی کے درخت ہیں اور بھائی بہن مدرسے جا رہے ہیں، اور سورج نکل رہا ہے اور کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے اس میں بچے ماں باپ کا ادب کرتے ہیں اور سلیم موہن کا دوست ہے اور رضیہ نرملا کی سہیلی ہے۔ گاؤں والو یہ تمھارے بچوں کا قاعدہ ہے۔ اسے قتل

نہ کرو، نئی زندگی کو ابھرنے دو۔"

ایک آواز۔ "کیا بکتا ہے یہ، پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرو دشمنوں سے مل گیا ہے یہ۔"

دوسری آوازیں۔ "ہاں، ہاں مار ڈالو اسے آگے بڑھو، دیر ہو رہی ہے۔"

استاد۔ "تمھیں بدلہ چاہیئے نا؟ دو آنکھوں کے بدلے میری دو آنکھیں لےلو"

چوتھی پانچویں آوازیں۔ "دیکھتے کیا ہو جی! آگے بڑھ جاؤ۔ یہ ماسٹر خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔"

آوازیں۔ "چلو آگے بڑھو۔ ہلا۔۔ہلا۔۔۔۔"

(شور کم ہو جاتا ہے۔ لڑکی کی آواز ابھرآتی ہے)

زینب۔ گاؤں والوں نے اسے مار ڈالا۔ اسکول کی چوکھٹ پر اسکول ماسٹر کا خون بہا۔ اس کے تازہ تازہ سرخ لہو کو دیکھ کر گاؤں والے ایک دم چونک گئے ان کا سارا غصہ اس کے مقدس لہو میں ڈوب گیا اور وہ پریشان ہو کے پیچھے ہٹ گئے اور اپنے کئے پر پشیمان ہو کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پھر اس دن کے بعد انھوں نے دوسرے فرقوں والوں کو کچھ نہیں کہا۔ ہمارے گاؤں میں اب سب امن چین سے رہتے ہیں اور کوئی کسی سے بیر نہیں کرتا اور اب کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

بیں د۔ "اب شاید تمھارا بیاہ بھی نمبردار کے بیٹے سے ہو گیا ہو گا؟

زینب۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرا شوہر زندہ ہے۔ لوگوں کے لئے وہ مر چکا ہے اور انھوں نے اسکول ماسٹر کی لاش کو قبر میں گاڑ دیا ہے۔

مگر میرے لئے وہ زندہ ہے اور اس کے جیتے جی میں نمبردار کے بیٹے سے کیسے شادی کر سکتی ہوں ؟ اب میں ہر روز اسکول میں پڑھاتی ہوں اور ہر روز ادھر کے قاعدہ میں مجھے اس کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے اور پھر میں مسکرا کر اسکول کے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں تو وہ سب مجھے اپنے ہی بچے معلوم ہوتے ہیں ، میں ، میرا شوہر ، میرے بچے ، اندھے لڑکے کی گائے ، میرا دیس ، کتنا خوبصورت ہے اجنبی !" ——— تم کس دیس کے رہنے والے ہو اجنبی ؟

میں ۔ " میرا کوئی دیس نہیں ہے ۔ میں انسانوں کی سڑک پہ رہتا ہوں ۔ چلتا ہوں اور کبھی کبھی رک رک کر کسی چشمے کی سطح سے ہونٹ ملا کے پیاس بجھا لیتا ہوں ۔"

اب تم اپنی گاگرے کو پرے ہٹا لو یہ پانی پی چکی ہے اور میرے کوٹ کی آستین چبا رہی ہے ۔

(ہنستی ہے ۔ اس کی گم ہوتی ہوئی ہنسی میں میوزک ابھرتا ہے)

چند لمحوں کے بیک گراؤنڈ میوزک (نشاطیہ) کے سر

اونچے ہوتے جاتے ہیں) پھر تھرتھرا کے گم ہو جاتے ہیں ۔

میں پھر سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں ۔ یہ سڑک جو مٹن سے پہلگام کو جاتی ہے ۔ مٹن ہندوؤں کا تیرتھ ہے یہاں دور دور سے جاتری آتے ہیں اور مٹن کے مندروں اور چشموں کے درشن کر کے امرناتھ کی طرف آگے بڑھتے ۔

مٹن براہمنوں کی بستی ہے اور یہاں ہزاروں برس سے براہمن رہتے بستے چلے آئے ہیں اور بے خوف و خطر پوجا پاٹ میں مصروف نظر آتے ہیں ۔

مٹن میں کوئی مسجد نہیں ہے ، حالانکہ آس پاس کے دیہات میں مسلمان آبادی کی کثرت ہے ۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے مٹن میں کوئی مسجد نہیں تھی ۔ اب کے جو کئی سالوں کے بعد میں آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں پہ ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے ۔ میں اس مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ۔ اور دوڑا دوڑا ملا جی کے پاس گیا ۔ ملا جی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں ۔

میں ؛ ۔ " ملا جی ! یہ مسجد کب بنی ؟"

ملا ؛ ۔ " فساد کے دنوں میں "

میں ۔ " فساد کے دنوں میں ؟ حیرت ہے ۔ فساد کے دنوں میں تو مسجدیں اور مندر بنتے نہیں ہیں ٹوٹتے ہیں ۔ آپ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہیں "۔

ملا ۔ " ہمارا ملک کشمیر بڑا عجیب ملک ہے نا ۔ اس لئے یہاں پر بڑی عجیب باتیں ہوتی ہیں "۔

میں ۔ " پوری بات بتائیے "۔

ملا " ۔ جب تمہارے ہاں فساد ہو رہا تھا اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں ، اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ہو کے پیاسے معلوم ہوتے تھے ان دنوں چند فسادیوں نے ہمارے یہاں مٹن میں آکر بھی فساد کرنا چاہا انہوں

نے آس پاس کے دیہاتوں میں کسانوں کو بھڑکا دیا کہ وہ شٹن کے مٹھ پر حملہ کریں اور براہمنوں کو تہ تیغ کر کے ان مسجدوں کا انتقام لیں جنھیں بے حرمت کیا گیا ہے۔"

میں "تو پھر کیا ہوا؟ مندر تو جلے نہیں ویسے ہی موجود ہیں۔"

ملّا "تم سنو تو، جب فسادی یہ کھچڑی پکا چکے، تو ان میں سے کچھ لوگ میرے پاس فتویٰ حاصل کرنے آئے۔ انھوں نے مجھے بہت مجبور کیا لیکن میں نے فتویٰ نہیں دیا۔ میں نے کہا ہمارے شعار کے خلاف ہے، اس پر وہ لوگ ناامید ہو کر چلے گئے۔

میں "تو پھر؟"

ملّا "لیکن فسادیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے کسانوں کو ورغلانا شروع کیا اور آخر میں چند لوگوں کو مٹھ پر حملہ کرنے کے لئے تیار بھی کر لیا۔ جب مجھے اطلاع ملی میں یہاں نہیں تھا۔ ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے بہت سے کسانوں کو مٹھ کی حفاظت کے لئے تیار کر لیا، اور ہم لوگ راتوں رات مٹھ کے سامنے پہنچ گئے۔ بیچارے پجاری بہت ڈرے ہوئے تھے۔ دور سے ڈھول تاشوں کی آواز آ رہی تھی، فسادی قریب آ رہے تھے

(مجمع کی آوازیں۔ ڈھول پیٹنے کی آوازیں)

آوازیں ۱ ـ
"یہاں مٹھ نہیں رہ سکتا۔"

۲ ـ شہید مسجدوں کا بدلہ لیا جائے گا"

۳ ـ جلا دو انھیں"

۴ ـ پجاریوں کو چشمے میں پھینک دو"

۵ ـ آگے بڑھو، جاؤ، لوہے کے جنگلے کو پار کر جاؤ۔ ان چشموں کی مچھلیاں تمہاری ہیں۔"

ملّا ـ "ٹھہرو۔ تم لوگ اس جنگلے سے آگے نہیں جا سکتے۔"

آواز ـ "کیوں نہیں جا سکتے؟ ہم سب کچھ پھونک کے رکھ دیں گے۔"

ملّا ـ "یہ شعار اسلامی کے خلاف ہے"

دوسری آواز ـ "ملّا دشمنوں سے مل گیا ہے۔"

تیسری ـ "ان کی طرفداری کر رہا ہے"

چوتھی ـ "ملّا جی سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

ملّا ـ "میرے بھتیجے جی۔ تم اس مٹھ پر حملہ نہیں کر سکتے۔ تم لوگ جن کے بہکانے میں آ کر حملہ کر رہے ہو وہ ہمارے دین کو برباد کر دیں گے۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں میرے بھتیجے جی یہاں فساد نہیں ہو سکتا۔"

ایک آواز ـ "ملّا جی ٹھیک کہتے ہیں۔"

دوسری ـ "کیا خاک ٹھیک کہتے ہیں۔"

تیسری ـ "یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں" ہزاروں برسوں سے یہاں رہتے

چلے آئے ہیں۔"

چوتھی آواز۔ ان ہی کے بھائیوں نے وہاں آگ لگائی ہے۔ ہم یہاں لگائیں گے۔

پہلی آواز ۔ نہیں، تم میں ہمت ہے تو وہاں جاکے لڑو، یہاں ہمیں کیوں برباد کرتے ہو۔

دوسری آواز۔ ملاجی! سنبھلئے! سنبھلئے!"

(شور بڑھ جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے آخر میں ملاجی کی آواز ابھر آتی ہے)

ملاجی۔ اسی دنگے میں میرا یہ ہات کٹ گیا۔ مگر مٹھ بچ گیا، کسانوں کو بہت جلد عقل آگئی کہ فسادی اپنا الو سیدھا کر رہے تھے۔ پجاریوں نے بھی میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس سے پہلے یہاں مٹھ کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ بن سکتی تھی، اب ان پجاریوں نے اور یہاں کے جاتریوں نے خود مسجد کے لئے چندہ جمع کیا۔ اور اس کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے پیش پیش رہے۔
یہ مسجد جو تم اب دیکھ رہے ہو اسی چندے سے بنی ہے۔"

میں ۔ ملاجی! آپ بہت اونچے آدمی ہیں۔"

ملاجی۔ میں ایک چھوٹا سا انسان ہوں بیٹا۔" ہاں میری مسجد بہت اونچی ہے۔ آسمان تک جاتی ہے۔"

(خوش آہنگ موسیقی چند لمحوں کے لئے بجتی ہے)

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں، یہ وہ میرا جانا پہچانا کشمیر نہیں ہے۔ یہ نیا کشمیر ہے زینب کا، استادجی کا، اور ملاجی کا کشمیر۔ کشمیر کے بیچ ڈل میں کھلے ہوئے نیلوفر کے پھول میں جو طوفان کی دھمک محسوس کرتے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، اور طوفان کی لہروں پر ڈول رہے ہیں، اور سنبھل سنبھل کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں اور سرخ پردوں والے شکارے تیزی سے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ہانجی چپو چلاتے ہوئے گا رہے ہیں

حسن و جمال کا شمیر
دلکش و شوخ دلپذیر
اپنا وطن ہے بے نظیر
پیارے وطن کے دوستو
سرکش و کامراں رہو
باغ نشاط کے گلو
شاد رہو جواں رہو

اردو افسانوی ادب میں گراں بہا اضافہ

سہاگ کی شام

مرتبہ سید محمد ہاشم

فنکار — صدیقہ بیگم عادل رشید لیلیٰ لکھنوی معین شاہد مجید۔پرویز یونس رمزی اکرم الہ آبادی ڈاکٹر حسن احمد خاں سلطانہ حور فاطمہ شکیل الیاس سیتاپوری۔

ریحانہ رومی

قیمت — تین روپیہ

الہ آباد پبلشنگ ہاؤس

الہ آباد

تارے ہنستے رہے

لیلیٰ لکھنوی اردو کی ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن میں عقل و دل کا توازن بدرجۂ اتم کارفرما ہے جن کی تحریریں جوانی کا بانکپن ہے اور خیالات کی رعنائی۔

ہندوستان کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی ان خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں کی صف اول میں محترمہ لیلیٰ لکھنوی اپنے رشحات فکر کے اعتبار پر ایک بلند مقام رکھتی ہیں ان کے افسانوں میں ہمارے سماج کی نہایت سادہ اور سچی تصویریں نظر آتی ہیں۔

انگریزی روزنامہ معاصر امرت بازار پتریکا رقمطراز ہے۔

لیلیٰ لکھنوی کی شخصیت میں ایک فنکار اور حقیقت نگار کا حسین امتزاج ہے وہ فن برائے فن کی قائل ہے ان کی کہانیاں "بجلی" "انتقام" اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ان چند بڑی کہانیوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی کسی بھی زبان میں نہیں لکھی گئی ہیں حقیقتاً لیلیٰ لکھنوی مستقبل کی بڑی فنکار ہیں۔

لیلیٰ لکھنوی کے اس مجموعہ کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی ہے پہلا ایڈیشن بہترین اینٹک کاغذ پر چھپا ہے۔

قیمت — ۲ روپیہ ۸ آنہ

الہ آباد پبلشنگ ہاؤس

الہ آباد